آہوانِ صحرا

قاضی قادن کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ

نیاز ہمایونی

شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کمیٹی بھٹ شاہ
حیدرآباد سندھ

آہوانِ صحرا

قاضی قادن کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ

نیاز ہمایونی

شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کمیٹی بھٹ شاہ
حیدرآباد سندھ

نام ــــــــــــــ آہوانِ صحرا

مترجم ــــــــــــــ نیاز ہمایونی

پرنٹرز ــــــــــــــ علمی پرنٹرز، کراچی

تعداد ــــــــــــــ ایک ہزار

سال ــــــــــــــ سنہ ۱۹۸۸ء

ناشر ــــــــــــــ عبدالحمید آخوند
سیکریٹری، شاہ عبداللطیف، بھٹ شاہ،
ثقافتی مرکز کمیٹی بھٹ شاہ، حیدرآباد، سندھ۔

قیمت ــــــــــــــ چالیس روپیہ

فہرست

انتساب

ابو علی سندھی کے نام

آنہا کہ نام آب بقا وضع کردہ اند
گفتند نکتہ ای ز دوام و بقای عشق

وحشی بافقی

حسب روایت شیخ روزبہان بقلی :۔ ابو علی از استادان بایزید است۔
بایزید (متوفی ۲۶۱ھ) گوید کہ من از ابو علی علم فنا در توحید آموختم۔
نفحات الانس فی حضرات القدس۔ مولانا جامیؒ
عنوان ابو علی سندھی قدس اللہ سرہٗ
ص ۵۷۔ طبع اصفہان۔ ایران۔

اپنا بیان

همه آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آنکہ روزی بہ شکار خواہی آمد

عام روایت کے مطابق مغل حکمران نورالدین جہانگیر ایک بار شکار کی غرض سے کشمیر گئے تو شاہی کارندوں نے ان کی خوشنودی کے لیے گردونواح سے بہت سے ہرن لاکر شاہراہ کے دونوں جانب چھوڑ دیئے جو پہاڑوں کے نشیب و فراز میں سرخم دکھائی دے رہے تھے۔

نورجہاں جو ان کے ساتھ ہم سفر تھیں، اس نے جب یہ عالم دیکھا تو امیر خسرو کا مندرجہ بالا شعر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا، جس سے وہ بہت محظوظ ہوئے۔

یہ شعر میں نے اسی مناسبت سے صوفیاء کرام کی تمثیل میں یہاں درج کیا ہے جو محبوب حقیقی کے عشق میں سرِبکف رہتے ہوئے حق و صداقت کی راہ میں جان دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی شعر کا ایک ٹکڑا "آہوان صحرا"، اس کتاب کا عنوان بنایا گیا ہے جسے میں اپنے لئے باعثِ افتخار تصور کرتا ہوں۔

آہوان صحرا پس منظر کے اعتبار سے جو اسے پڑھتے ہی ذہن میں ابھر آتا ہے ایک عجیب سا سماں پیش کرتا ہے، جس سے صوفیانہ مسلک کی عکاسی ہوتی ہے۔ میں نے برسوں سے اس شعر کو ورد جاں بنائے رکھا تھا اور آج اسی عزیز جذبے کے تحت یہ سعادت حاصل کر رہا ہوں جو پیشِ خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف!

نیاز ہمایونی

اُردو سائنس بورڈ حیدرآباد (۱۲ مارچ ۱۹۸۸ء)

جگ کو سنواریں جو سامی

جناب عبدالغفار شیخ

سندھی زبان کے نامور شاعر نیاز ہمایونی کی علمی ادبی خدمات کا سلسلہ نہ صرف سندھی زبان تک محدود ہے بلکہ اس کی وسعت اُردو، فارسی اور سرائیکی زبانوں تک ہے۔ آپ نے فارسی زبان کو طبعزاد نظم و نثر کے علاوہ تراجم کے زیور سے بھی آراستہ کیا ہے تو سرائیکی کو بھی سندھی کی طرح مادری زبان تصور کرتے ہوئے اس میں پر معنی الفاظ و فکر انگیز انداز سے مزیں شاعری کرتے رہے ہیں۔

ادھر اُردو نظم و نثر میں بھی آپ کی کاوشیں قابل تعریف ہیں جس کی زندہ مثالیں آپ کی نگارشات سندھی نامہ، سندھی شاعری سے انتخاب، آہوان صحرا، سمندر کی سانس اور زیرِ ترتیب "دیوانِ نیاز"، کی صورت میں موجود ہیں۔

نیاز صاحب نے چند برس پہلے جب حضرت شاہ عبداللطیف اور ان کے ہم عصر بزرگ خواجہ محمد زماں کی لازوال سندھی شاعری کو منظوم ترجمے کے ذریعے فارسی زبان کے مشاہیر کی خدمت میں پیش کیا تو اس کی پسندیدگی کے پیشِ نظر اُردو سے تعلق رکھنے والے احباب نے بھی یہ ضرورت محسوس کی کہ اسی طرح اُردو کو بھی ایسے ترجمے کی نعمت سے مستفیض کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بناء پر سندھی

عبدالغفار شیخ صاحب گیس ٹربائن پاور اسٹیشن واپڈا کوٹری میں سینئر انجنیئر ہیں آپ نہ صرف ایک لائق و فائق انجنیئر ہیں بلکہ ایک بہترین محقق، ماہر آثارِ قدیمہ، ریسرچ اسکالر، طبیب اور بھی ہیں جن کی نگارشات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔

زبان کے قدیم اور قادر الکلام شاعر قاضی قادن کے کلام کو جو کچھ عرصہ پہلے بھارت سے دستیاب ہو چکا تھا، منظوم اُردو ترجمے کے لباس میں ترتیب دیا گیا تاکہ اُردو داں طبقہ بھی اس کے فیض سے بہرہ ور ہو سکے۔

قبل ازیں نیاز صاحب نے سندھی کلاسیکی شعراء لطف اللہ قادری، شاہ کریم، شاہ عنایت، سچل سرمست اور سامی جیسے شہرہ آفاق صوفی شاعروں کی تخلیقات سے سینکڑوں چیدہ ابیات کا بطور تجربہ اُردو میں ترجمہ کیا تھا جو کافی حد تک کامیاب رہا۔ اور یہ بات ان کے لیے ہمت افزا ثابت ہوئی جس کے بعد یہ منظوم ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

نیاز صاحب کے خیال میں یہ ترجمہ زبان و بیان کے لحاظ سے جس انداز میں کیا گیا ہے اسے اسی انداز میں منظر عام پر لایا جائے اور اگر اس میں نظر ثانی کے بعد کسی رد و بدل کی نوعیت پیش آئی تو سارا لُطف جاتا رہے گا۔ ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس شاہکار کو اسی صورت میں پیش کیا جانا چاہیئے جو وہ خود اس کو عطا کر چکے ہیں تاکہ اس کی اصلیّت قائم رہ سکے اور ترجمہ نگار کو بھی یہ اطمینان رہے کہ ان کی اپنی محنت کس حد تک مقبول عام ہونے کا شرف حاصل کر سکتی ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نیاز صاحب نے یہ ترجمہ دوہے کے طرز پر منظوم کیا ہے جو سندھی دوہڑے کے قبیل سے ہونے کے باعث اس سے مزاجی ہم آہنگی کا

آپ کے پاس نوادرات و نایاب کتب کا بے مثل ذخیرہ موجود ہے سال ۱۹۸۶ء میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے آپ کو گولڈ میڈل اور خصوصی شیلڈ سے نوازا ہے۔ واپڈا اتھارٹی نے بھی سند اعتراف اور سند امتیاز ۱۹۸۱ — ۱۹۸۵ء میں عطا کی ہیں۔ آپ کی زیر طبع تصنیف "آپ سندھ کو جانتے ہی ہیں" سندھ کی تاریخ میں ایک مایہ ناز اضافہ ہوگی جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے کیا گیا ہے۔

حامل ہے اُسی خصوصیت کے پیشِ نظر ترجمہ شدہ دوہوں میں ان کا رواں دواں انداز بہت بھلا لگ رہا ہے مثال کے طور پر۔

جا کے آیا واپس کون اس دنیا سے جو چلا گیا
اس کا لوٹ کے آنا مشکل

جانے والوں کا ہے باقی اب نہ زماں و مکاں یہاں
کون کرے گا اگلے جہاں کی باتیں آ کے بیان یہاں

دراصل اُردو دوہے کا یہ انداز مترجم نے اپنے طبعزاد سندھی دوہوں کے تتبع پر کیا ہے جو اس کا انفرادی انداز ہے اور بہت ہی اچھا انداز ہے جیسے وہ ترنم سے پیش کرتے ہیں۔ ترجمے میں روانی کی اس خوبی کے ساتھ ساتھ زبان اور اندازِ بیان بھی ستائش کے قابل ہے جس میں کسی قسم کی لسانی نوعیت کی اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ نیاز صاحب فارسی کے عالم ہیں لیکن یہاں کہیں بھی اس کا نمایاں اثر و تاثیر دکھائی نہیں دیتا جو اکثر فارسی سے تعلق رکھنے والے حضرات اختیار کرتے ہیں۔

اب میں نیاز صاحب کی سندھی، سرائیکی اور فارسی اُردو طبعزاد شاعری سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں جو ان کی بلند خیالی اور بلند معیاری کی گواہی دیتے ہیں "دیوانِ نیاز" کے چند اُردو اشعار ہیں:۔

۔ جب زمانے میں محبت ہو چکے صیدِ ہوس
لوگ کرتے ہیں گزارہ نفرتوں کے درمیاں

۔ عشق ہو جائے موسیٰ تو پھر خود بخود ـــ حسن بن جائے گا طورِ سینا میاں

۔ پھول کھلائے سب نے اپنے آنگن میں
ہم دیوانے کانٹے گھر میں بوتے رہے

ہر کلی روتی ہوئی آنکھ بنی جاتی ہے
یاد آیا نہ کریں آپ بہاروں میں کبھی

سرائیکی سے (ترجمہ) :-

جب سے میرے یار نے مسکرانا سیکھا ہے
قتلِ عام کا امکان پیدا ہو چکا ہے
ہم نے پہلے سے ہی سَر پہ کفن باندھ رکھا ہے

فارسی سے :-

دیار سند کہ چوں مادری بہ طفلاں است
غم اندک بکویش خوشی فراواں است
خوشا کنارہ ای مہران وسحر نظارہ
اداں چو کبک درش آب، آبِ حیوان است
زمین او چو بہ موسم شباب لی گیرُد
مثال سینہ ای دوشیزہ فرح ساماں است

اور اب سندھی سے چند اشعار (ترجمہ) :-

اس دور میں ہمارا اظہار یاد رکھنا
اقرار یاد رکھنا، انکار یاد رکھنا
سچ زہر ہے تو بھی ہم پیتے ہیں جام اس کے
اے زندگی ہمارا، کردار یاد رکھنا
یہ قید و موت پھر بھی اپنا ضمیر زندہ
جاری رہے گی اپنی پیکار یاد رکھنا

نیاز صاحب اس سے پہلے خواجہ محمد زمان کے ابیات سندھی کا فارسی

میں منظوم ترجمہ کر چکے تھے اس کے بعد آپ نے اس کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا ہے مگر وہ ترجمہ قاضی قادن کے کلام کے ترجمے سے منفرد ہے اس صورت میں کہ یہاں ایک شعر یا بیت کا دو عدد دوہوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ تو وہاں ایک بیت کا ایک ہی دوہے میں ترجمہ ملتا ہے جو کوزے میں دریا بند کرنے کے مصداق بلند معیار ترجمے کا ثبوت ہے۔ اس کے متعلق بلوچستان کے مشہور ادیب و شاعر، صحافی اور مقرر جناب ملک محمد رمضان صاحب لاہور میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے منعقدہ ادبی اجتماع میں نیاز صاحب کو خراج تحسین پیش کر چکے ہیں کہ

"نیاز ہمایونی نے اپنے مقالے سندھ کی کلاسیکی شاعری میں اپنے منظوم اُردو ترجمے کے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ ان کے اس شاعرانہ کمال کا مظہر ہیں جو قدرت کی جانب سے ایک ذہین اہلِ قلم کو عطا کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اتنا بے داغ اور بہترین ہے کہ اگر وہ اسے ترجمہ کہنے کے عوض اپنے نام سے منسوب کرتے تو بھی ہم یقین کر لیتے کہ واقعی یہ نقل نہیں بلکہ اصل ہے!"

اس ترجمے کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ سُکھ کی آس لگائیں مورکھ، سامی دُکھ اپناتے ہیں
جس دُکھ سے آرام انھیں یہ اسی سے جی بہلاتے ہیں

۲۔ دُنیا کا میں دامن چھوڑوں، کروں نچھاور عقبٰی بھی
ساجن مجھ سے کرے جو سکھیو! ایل بھر پیار کا دعویٰ بھی

۳۔ جب تک تجھ کو فکر ہے جاں کی جوگی تیرا نام نہیں
حاصل کرتے ہیں وہ مرادیں جن کو جاں سے کام نہیں

۴۔ سامی نکلیں تنہا اپنی ذات بھی پیچھے چھوڑ چلیں
پیا ملن کی آس میں اپنے ہونے سے مُنہ موڑ چلیں

۵۔ موج اور ساگر ایک ہیں پھر بھی نظر نظر کا فرق ہے
کسی نے ساگر پار کیا، اور کوئی موج میں غرق ہوا

اب یہاں چند ابیات کے ترجمے قارئین کرام کے سامنے دہرائے جاتے ہیں جن سے سندھ کی اوائلی شاعری کے قالب میں ڈھالے ہوئے اس فلسفہ وفکر کی نشاندہی کرانا مقصود ہے جو بنی نوع انسان کی بہتری اور بہبودی کے لیے قرطاس وقلم کی زینت بنا ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں ایک واضح اشارہ ملتا ہے کہ انسان سعی ومحنت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی اشارے کی اساس پر قاضی قادن کہتے ہیں۔

بھٹے میں جب اینٹ جلے اور جل کر پختہ ہو جائے
محلوں کی بنیاد بنے دیوار کا پشتہ ہو جائے
تو بھی اپنے آپ کو پختہ کر، دُکھ کے انگاروں میں
تاکہ وہ سانول کرے شمار تجھے بھی اپنے پیاروں میں

ایسا ہی ایک اور اشارہ ملتا ہے کہ انسان جب تک اپنے آپ کو نہیں بدلے گا تب تک خدا بھی اس کی فطرت میں تبدیلی نہیں لائے گا۔ قاضی قادن اس اشارے کی ترجمانی یوں کرتے ہیں۔

الگ ہوئے جو اپنے آپ سے جا کر ان کے چہرے دیکھ
عشق نے ہیں کس ڈھب سے سجائے ان پر نور کے سہرے دیکھ

کل تک جو تھے فرش نشیں آج عرش بریں پر بستے ہیں
دل والوں کی شان عجب کس دلداری سے رہتے ہیں

ایک اشارہ اس طرح کا بھی ہے کہ جو لوگ راہ حق میں شہید ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ قاضی قادن کے ہاں اس کی عکاسی اس طرح ملتی ہے۔

جن کے من میں محبّت ہے وہ مر گئے تب بھی زندہ ہیں
نہیں ہے جن میں یہ جوہر وہ جیتے جی بھی مردہ ہیں
پیار کی شمع جلا دی جس نے اپنے دھندلے اندر میں
ساجن ہوگا پے ساکن، جیسے دیوا مندر میں

یہ تو تھے زندگی کے اولین اصول جن پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انسان دنیا اور آخرت میں اپنے آپ کو اچھا ثابت کر سکتا ہے۔ تاہم یہ صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان اگر اسی طرح سیدھی راہ اختیار کر کے آگے بڑھے گا تو اسے اسی نہج پر چلنا ہوگا کہ یہاں جو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا اور یہ سب انسان کے کسب و محنت پر منحصر ہے اس زمرے میں قاضی قادن کا ایک بیت ہے جس کا ترجمہ یوں پیش کیا جا چکا ہے۔

دل کی آنکھیں روشن کر کے اتریں جو دریاؤں میں
سمٹ کے آئیں سارے موتی، آپ ہی ان کی کٹیاؤں میں
دریا جیسا عشق اگر یہ عشق مکمل تجھ میں ہے
تیرا مقصد تیری مراد اور تیری منزل تجھ میں ہے

زندگی کے جن مراحل میں سعی و محنت، تغیر و تبدل کی ضرورت ہوتی ہے اسے ایک قسم کا جہاد کہا جاتا ہے اگر اس جہاد میں آدمی زندہ رہا تو بھی

اس کے وارے نیارے ہیں اور اگر اس کی جان جاتی رہی تو پھر بھی وہ زندہ متصور ہوگا۔ یہی انسان کی شان ہے کہ اسے زندگی میں یا زندگی کے بعد اپنی اچھائیوں کے طفیل قابل تحسین تسلیم کیا جائے، ایسے انسانوں کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ روشن ضمیری کے ساتھ جو بھی کام کریں گے اس میں کامیاب ہوں گے اور آخر کار وہ اپنا مقصد اپنی مراد اور اپنی منزل حاصل کر ہی لیں گے۔

یاد رہے کہ یہ تمام باتیں صرف توحید کے تصور سے پیدا ہو سکتی ہیں اور اس کے بدولت انسان اپنے آپ کو انسان دوستی کے پُرخلوص جذبے سے سرشار کرتے ہوئے تمام انسانوں کی بہی خواہی کے لیے کوشاں رہتا ہے اس خیال سے کہ تمام انسان نیکی کی نیت سے تخلیق کئے گئے ہیں اور ان سب کو ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہو کر اسے اپنے حصّے کا سکھ مہیا کر کے دینا ہے جس پر اس کا حق بنتا ہے۔

نزول قرآن کے بعد اس کی رہنمائی میں یہاں کے صوفیوں اور ولیوں نے انسان کو توحید کی تربیت دے کر مکمل انسان بننے کی ترغیب دلائی جس کی بناء پر ایک سے ایک بڑھ کر مشائخ ابھرتے رہے اور انہوں نے بنی نوع انسان کو بلند مرتبت بنانے میں تمام تر کوششیں صرف کیں، لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بقول شاہ عبداللطیف یہاں کے لوگ اسلام کے آنے سے پہلے نیکی اور سچائی کی صدا پر لبیک کہہ چکے تھے۔ جو اسلام سے پہلے دی گئی وہ اذان سُن چکے تھے۔ شاہ صاحب سے پہلے قاضی قادن بھی اس صدا کی تصدیق کرتے ہیں۔

صدا تھی اپنے ساجن کی جو اپنے دل سے نکلی تھی
اسس کا خطاب ہمیں سے ہی تھا، ہم نے حقیقت سمجھی تھی

جس دن کو یہ صدا سُنی، ہم اس دن اس پہ فدا ہوئے
ساجن سے یوں ملے کہ اب تک، کبھی نہ اس سے جُدا ہوئے

مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن میں ایک جگہ لکھتے ہیں ٥ کہ موہن جو ڈرو کے آثار ہمیں آریاؤں کے عہد ورود سے بھی آگے لے جاتے ہیں ان کی تحقیق کا کام اگرچہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے تاہم یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اس قدیم ترین انسانی بستی کے باشندوں کا بنیادی تصور توحید الٰہی تھا اصنام پرستانہ تصور نہیں تھا۔ وہ اپنے یگانہ خدا کو "اون" کے نام سے پکارتے تھے جس کی مشابہت ہمیں سنسکرت کے لفظ اندورن میں مل جاتی ہے۔ یہی یگانہ ہستی سب پر محیط ہے اور طاقت کی تمام ہستیاں اسی کے وضع کردہ قوانین کے تحت کام کر رہی ہیں۔

سندھ کے صوفیوں اور ولیوں نے توحید کو منزل مقصود بنا کر وحدت الوجود کے مسلک کو اپنایا تھا اور اسی پر کاربند رہتے آئے چنانچہ اس مسلک کے مطابق انہوں نے سب سے اوّل اصلاح اخلاق کی مہم چلائی اس لیے کہ زہد و تقویٰ کا انحصار ہی اسی پر ہوتا ہے۔

امام خطیب رازی کہتے ہیں۔ جس انسان میں نیکی بدی کا امتیاز موجود ہو گا وہی انسانی اخلاق کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہے گا سندھ میں بھی چونکہ پہلے سے نیکی بدی کا امتیاز موجود تھا اس لئے یہاں کے صوفیوں نے اخلاقی قدروں کو بہتر سے بہتر بنانے کے جتن کئے اور ان کی تمام نگارشات ایسی تعلیم و تربیت پر مبنی رہیں۔ یہ سب وحدت الوجود کے فلسفہ و فکر کا نتیجہ تھا جس نے

---

٥ ترجمان القرآن تفسیر سورۃ فاتحہ ص ۱۳۰ــ ۱۲۹ طبع اپریل ۱۹۷۶ء اسلامی اکادمی لاہور۔

دوسری اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کی اچھائی کو فکری اور عملی طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس جدوجہد میں کئی کئی صوفیوں نے ایک طرف قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں تو دوسری جانب کئی بزرگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اس کے باوجود صوفیانہ مسلک کی پیشرفت رک نہ سکی۔

بقول قاضی قادن :۔

جگ کو سنواریں جو سائیں، وہ جگ میں ہیں آباد ابھی
گھوم رہے ہیں نگر نگر اور گلی گلی آزاد ابھی
ان سے جو بھی مانگے گا وہ ان کا دامن بھر دیں گے
سارے بھید ہیں ان کے پاس جو پوچھے ظاہر کر دیں گے

صوفیانہ مسلک کے مطابق اخلاقی قدروں کا عروج انسان کی مادی اور روحانی ترقی کا باعث ہے اور اسی کے سہارے وہ نیکی کے قریب ہو کر باطل کی قوتوں کو مسمار کر سکتا ہے اس کے برعکس اخلاقی قدروں کا زوال قوموں کے زوال کا موجب ہوتا ہے۔ انسان جب اپنی غرض کے مطابق اخلاقی قدروں کی اصلیت میں ردوبدل کر کے ان کو اپنے مقصد کے مطابق مطلب و معنی کے بہروپ میں لاتا ہے تو پوری قوم کو اس گمراہی اور تباہی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

صوفیوں نے صدیوں کے تجربات کی روشنی میں نیکی کے ساتھ سچائی کی تبلیغ کی اور سینہ سپر ہو کر باطل قوتوں سے نبرد آزما ہے ان کے خیال میں نیکی اور سچائی دونوں الٰہی نور و رحمت کے سرچشمے ہیں ان کا اگر ایک ذرہ بھی انسان کے حصّے میں آجائے تو وہ اس کی قوت و کرامت سے ظلمت و جہالت کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کلاسیک کے بارے میں

زندگی کو متحرک رکھنے کے لیے دو قوتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ان میں سے ایک قوت مرکز مائل اور دوسری قوت مرکز گریز کہلاتی ہے آپ انہیں داخلی اور خارجی، رجعتی اور انقلابی، کلاسیکی اور روحانی قوتوں کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ زندگی کا مدوجزر انہیں دونوں قوتوں کی ہم آہنگی سے تعبیر ہوتا ہے۔ فرد کی شخصیت اور کردار و عمل کی تشکیل و ترتیب میں بھی انہیں دو قوتوں کا حصّہ زیادہ ہے۔

شعور کی قوت جو فرد کو مرکز کے ساتھ وابستہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے، ارسطو سے منسوب ہوتی ہے جو کلاسیکی رُجحان طبع کو پروان چڑھاتی ہے لیکن جب شخصیت پرسکون ہو اور جمود کی دبیز کائی جمنے لگے تو روح کی مرکز گریز قوت یکسانیت کی اس برف کو توڑ کر کسی نئے افق کو دریافت کرنے کی سعی کرتی ہے۔ اس کا رشتہ تفکر افلاطون سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

اول کہ ایک مضبوط نظام ترتیب دینے کی کوشش کرتی ہے جبکہ الذکر قوت اس نظام کے خلاف بغاوت کر کے فرد کو جامد پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ونڈہم لیوئس نے لکھا ہے کہ جب میں کسی ٹھوس چیز کا تصور کرتا ہوں تو میں اُن لوگوں کے ساتھ شریک ہوتا ہوں جو اس ٹھوس چیز کی تعبیر کے لئے لفظ کلاسیک استعمال کرتے ہیں۔ اور جب میں کسی آشفتہ سر پریشان حال اور منتشر شے کا خیال کرتا ہوں تو میرا ذہن روحانیت کی اصطلاح استعمال کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

محترم ڈاکٹر انور سدید کے مضمون "کلاسیک کیا ہے" مطبوعہ جولائی ۱۹۷۷ء سے شکریہ کے ساتھ اخذ کردہ۔ مرتب

درحقیقت جو تخلیق ارسطو کی فکری اساس کو دوبارہ وجود میں لاتی ہے اور عامتہ الناس کے ذہن میں ہر زمانے میں یکساں طور پر تاثیر پیدا کرتی ہے۔ اسے دوامی حیثیت حاصل ہے اور یہی کلاسیک ہے۔ اس کے برعکس جس تخلیق کو منطق اپنی گرفت میں نہ لے سکے وہ اڑتی ہوئی گرد کی طرح آوارہ بکھرے ہوئے ذروں کی طرح پریشان ہو اس کی حیثیت غیر دوامی اور تغیر آشنا ہے۔ یہ تخلیق رومانی نوعیت کی ہے۔ لیوٹس نے اس مؤقف کی توضیح کے لیے ارسٹو فینز اور موسئیر کی تخلیقات کو کلاسیکی اور آسکر وائلڈ کی تخلیقات کو روحانی قرار دیا ہے، اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کلاسیکیت کا تعلق ہیئت سے اور روحانیت کا روح سے ہے تاہم کلاسیک چونکہ غیر شخصی ہوتا ہے اور اس میں صدیوں پرانی روایات اور نسلوں کا دل بھی دھڑک رہا ہوتا ہے اور یہ مستقبل کے قاری کو بھی یکساں جمالیاتی تسکین عطا کرتا ہے، اس لیے کلاسیک کو محض ہیئت کہنا اس کی قدر و قیمت کم کرنا ہے۔ ہیئت اس وقت تک کچھ اہمیت نہیں رکھتی جب تک کہ اس کے داخل میں ایک لو دیتا ہوا خیال موجود نہ ہو اور کلاسیک میں پرعظمت خیال پرشکوہ تصور اور ایسی فکر جو حیات دوام حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو ہمیشہ اہم شمار ہوتی ہے۔

لیوٹس کے مندرجہ بالا اقتباس میں روحانیت اور کلاسیکیت کی بنیادی روح موجود ہے اور بہت سے دوسرے ارباب نے جو تعریفات وضع کی ہیں ان میں لیوٹس کے خیالات کی بازگشت یا اس کا رد عمل موجود نظر آتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ کلاسیک ذاتی کے بجائے غیر ذاتی زمانی لحاظ سے دوامی اور غیر فانی موضوعی کے بجائے معروضی، خواب گوں کے بجائے حقیقی اور مابعد الطبعیاتی کے بجائے عملی ہوتا ہے اسی طرح اسے ایک ایسا آئینہ قرار دیا گیا جس میں ہر زمانہ بآسانی اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔

یہ سب تعریفات کلاسیک کو ایک وسیع تناظر عطا کرتی ہیں اور اس کے حدود تخلیق کو زماں و مکاں سے بھی ماورا کر دیتی ہیں تاہم اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ کلاسیکیت جامد اصولوں کی قید میں پابند ہو گئی اور اس سے جدیدیت کا عنصر یکسر خارج کر دیا گیا اور یوں اسے معاشرے کے مروج اقدار کا غلام بنانے کی سعی کی گئی چنانچہ ہربرٹ ریڈ نے اس تصور کے خلاف برملا احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ " کلاسیکیت سیاسی ظلم کا ادبی زاویہ ہے۔ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں اس نے یہی ظالمانہ کردار ادا کیا تھا اور اب احیاء العلوم کی آمرانہ قوتوں کو نمایاں کرنے کے لیے اس کی تجدید ہو رہی ہے۔

ہربرٹ ریڈ کی یہ رائے جانبدارانہ اور متشدد نظریات پر مبنی ہے اگر اسے کُلیتاً تسلیم کر لیا جائے تو زندگی کے ایک اہم رُخ کے بارے میں غلط تاثر پیدا ہو جاتا ہے، درحقیقت زندگی کا ایک زاویہ تخلیقی اور آزاد ہے اور یہ رومانی زاویہ ہے۔ دوسرا زاویہ نظم اور ضبط کا ہے اور یہ کلاسیکی زاویہ ہے۔ زندگی کے کل میں ان دونوں زاویوں نے یکساں اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ اس کی قدر و قیمت کم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک روحانی جذبہ کلاسیکی نظام ضبط میں رہ کر ہی پوری تخلیقی سرگرمی کا اظہار کر سکتا ہے۔ اور کلاسیکی ادب پارہ اگر ذہن کا افق وسیع نہیں کرتا تو خوبصورت الفاظ اور پرشکوہ اسلوب کے باوصف اسکی حیثیت ایک بے جان بُت سے زیادہ نہیں، اس حالت میں اصل مسئلہ روحانیت اور کلاسیکیت کا نہیں بلکہ ادب کا ہے۔ اگر ادب زندگی کی صداقت کو تخلیقی رعنائی سے پیش کرتا ہے تو روحانی یا کلاسیکی ہونے کے باوصف یہ دل میں اتر جائے گا اور زمانے پر مہر دوام ثبت کرے گا اس معیار تک پہنچنا ہی ادب کا نقطۂ معراج ہے۔

کلاسیک کی اولین خصوصیت اس کا موضوع ہے ہر تخلیق میں موضوع اساسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، کلاسیکی تخلیق بڑے موضوع کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتی۔

کلاسیک کی دوسری اہم خصوصیت اس کا اسلوب ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوب خیال اور ہیئت کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر و باطن ہیں اور لفظ ان دونوں کے باہمی اشتراک کا وسیلہ ہے، لفظ کا درست اور برمحل استعمال، خیال میں قوت پیدا کرتا ہے اس سے اس کی گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی معنویت بھی بڑھ جاتی ہے۔

لفظ دراصل وہ جسم ہے جسے خیال کی روح تحرک اور تازگی عطا کرتی ہے، ادیب کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی ساحری سے الفاظ کی مرمریں مورتیوں میں زندگی کا فسوں اس طرح دوڑائے کہ ان الفاظ کو اعجاز گویائی حاصل ہو جائے اور وہ قاری سے یوں باتیں کرنے لگیں جس طرح ادیب تخلیقی لمحے میں خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔

کلاسیک کی تیسری اہم خصوصیت ادیب کی شخصیت ہے جس طرح ایک عظیم موضوع کا خیال صرف اس ادیب کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے جو ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہو اور جس کے فکر و نظر علم و دانش اور بیان و اظہار کے قرینے بوقلموں ہوں۔ کلاسیک چونکہ فنا کا غماز ہوتا ہے اس لیے یہ اپنا تمام تخلیقی مواد معاشرے کی تہذیبی جہت سے حاصل کرتا ہے ادیب جتنا مہذب ہو گا اس کی تخلیق بھی اسی تناسب سے شائستہ ہو گی اور اس کا خیال اسی قوت سے عامۃ الناس کو تہذیبی رفعت عطا کرتا رہے گا۔

تہذیب کا اولین دور کلچر کہلاتا ہے یہ دور تخلیقی لحاظ سے بے حد زرخیز ہوتا ہے، شاعری کا ابتدائی دور بھی کلچر سے مشابہ ہے اس دور میں شاعر کے جذبات سادہ اور احساسات غیر تراشیدہ ہوتے ہیں وہ قبیلے کی آواز ہوتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے سادگی اور بے ساختگی سے لب پر لے آتا ہے، اسی دور میں عموماً لوک گیت تخلیق ہوتے ہیں۔

کلچر کا دوسرا مرحلہ تہذیب کا ہے تہذیب کے اس دور میں شاعر مرصع ساز

کا کردار ادا کرتا ہے اور کسی نئے افق کو دریافت کرنے کے بجائے تہذیبی قدروں کے تحفظ کا اہتمام کرتا ہے، زبان کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں لگ جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ خیالات کو شائستگی اور جذبات کو توازن عطا کرتا ہے اور یوں اپنی عظیم شخصیت سے ایسا ادب تخلیق کرتا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ منزل بن جاتا ہے۔

ابوعلی سندھی

علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی کی تحقیق کے مطابق سندھ کے ایک نومسلم بزرگ صوفی ابوعلی سندھی، سندھ سے عازم سفر ہوکر بسطام جا پہنچے تھے جہاں ان کی ملاقات شیخ بایزید سے ہوئی تھی۔ بایزید بسطامی اور ابوعلی سندھی کی اس تاریخی ملاقات کا تذکرہ مولانا عبدالرحمٰن جامی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "نفحات الانس"، میں اس طرح کرتے ہیں کہ:۔

حسب روایت شیخ روزبہان بقلی، ابوعلی ازاستادان بایزید است،
بایزید (متوفی ۲۶۱ھ) گوید کہ من از بوعلی علم فنا در توحید آموختم۔

آگے چل کر بایزید بسطامی میں جو فکری تبدیلی آئی وہ سندھ کے اس بزرگ صوفی کی صحبت کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح ایرانی تصوف پر برصغیر کے فلسفہ ویدانت کا پرتو پڑا جس کی بھرپور روشنی سندھ میں فارسی شاعری کے ذریعے دوبارہ واپس آگئی۔

ابوعلی سندھی کے متعلق روایت ہے کہ آپ سندھ میں ککرالہ کے رہنے والے تھے جو کسی زمانے میں یہاں ایک ریاست کی صورت میں بہت سرسبز و آباد علاقہ تھا۔ اس بارے میں دو مفصل مضامین میں سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

ککرالہ کی قدامت بھی موہن جو دڑو کی طرح قدیم ہے ویسے بھی یہ علاقہ سندھ کی تاریخ کا زرین باب کا حامل ہے۔ ساحلی علاقہ ہونے کی بناء پر اس نے کئی انقلابات دیکھے ہیں۔ سب سے پہلے یہاں ایران کے دارا اوّل (۵۱۶ ق.م) قابض ہوئے نیز سکندر اعظم (۳۲۳ ق.م) کی آمد کا ذکر بھی ملتا ہے جو اسی طرح یہاں وارد ہوئے تھے۔ ایچ۔ ٹی لمبرک رقم طراز ہیں کہ "سکندر اعظم جب نیرون کوٹ میں داخل ہوئے تو اس نے اپنے امیر البحر کو حکم دیا کہ ہمیں سندھ کا خطہ "لاڑ"، دکھایا جائے، چنانچہ وہ نیرون کوٹ سے

سندھ کے ذریعے اس علاقے میں پہنچا۔ اس زمانے میں یہاں کچھ پہاڑی ٹیکریاں موجود تھیں جہاں جہاز لنگرانداز ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنی تحقیق کے مطابق مزید لکھتے ہیں کہ لاڑ کے زیریں خطے میں یہ پہاڑی ٹیکریاں لکرالہ کے سوائے کہیں اور موجود نہیں تھیں یہی ٹیکریاں اب اُبھن شاہ کی ٹیکریاں کہلاتی ہیں جو ابھی تک اسی جگہ پر موجود اور تحصیل شاہ بندر کے مرکزی شہر چوہڑ جمالی سے تین میل کے فاصلے پر مغرب کی سمت شاہ بندر کو جانے والی کچی سڑک کے بائیں کنارے واقع ہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے اس ریاست میں موجودہ کھاروچھان، کیٹی بندر، شاہ بندر، اور تحصیل جاتی کا جنوبی سمندری حصہ شامل تھے۔ کیٹی بندر کے علاوہ اس علاقہ کے خاص شہروں کے نام یہ ہیں۔ شاہ میہڑو، لنجاری، کوڈارلو، گجو، اور رنگا بندر، ابھن شاہ کی ٹیکریاں وغیرہ۔

جس طرح یہ خطہ مختلف حکمرانوں کی آماج گاہ بنا رہا اسی طرح متعدد دولیوں، درویشوں اور عالموں، عارفوں کی آرام گاہ بھی رہ چکا ہے۔ یہاں کئی نادر اور نامور ہستیاں مدفون ہیں جیسے "درویش صالح، پیر لاکھو، شیخ اسمٰعیل، شیخ مغل بھین، متوفی (۱۰۰۶ھ) شیخ اڈرو ہالائی، شیخ کیریو، مخدوم جلال جو بقول میر علی شیر قانع جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ طب اور نجوم میں بھی بقراط ثانی اور بو علی اول مانے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمود، سید یقین شاہ، شیخ امام الدین اور ابھن شاہ جن کے مزار ابھی تک مرجع خلائق ہیں۔

ابو علی سندھی بھی اسی ریاست (لکرالہ) کے باشندے تھے جن کی بزرگ ہستی بایزید بسطامی جیسے جلیل القدر صوفی کے استاد محترم کی حیثیت سے سندھ کیلئے باعث افتخار ہے۔ لکرالہ کی اس تاریخی ریاست پر دنیا کی نامور شخصیتوں نے حکومت کی تھی، سب سے پہلے یہاں خطہ کچھ کے راجاؤں کا تسلط قائم ہوا بعد میں اس علاقے کو مشہور

سمہ خاندان نے اپنے زیرِ نگیں رکھا ان کی حکومت ۱۵۵۵ء تک رہی۔ پھر یہاں ترخان آئے اور مرزا شاہ حسن ارغون کی وفات کے بعد یہ علاقہ مرزا عیسیٰ ترخان اول کی ملک ہوا جس کی وفات ۱۵۶۶ء میں ہوئی۔ بعد میں یہ علاقہ مرزا باقی ترخان کے تصرف میں آیا۔ آخر میں مرزا جانی بیگ کے جانشین بیٹے مرزا غازی بیگ کی باری آئی جو ۱۶۱۲ء میں فوت ہو گئے۔ بعد ازاں مغلیہ دور کا آغاز ہوا جو منظم طور پر یہاں حکومت کرنے لگے۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور (۱۶۴۸ء۔ ۱۶۵۲ء) میں یہاں اورنگا بندر کے نام سے ایک نئی بندرگاہ تعمیر ہوئی جب کلہوڑا دور (۱۷۴۴ء) شروع ہوا تو میاں غلام شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں ایک اور بندرگاہ "شاہ بندر" کے نام سے تعمیر کرائی جو ابھی تک منظرِ عام پر موجود ہے۔

بحوالہ:۔ (۱) شاہ لطیف جی (کی) شاعری۔ ڈاکٹر تنویر عباسی ص ۴۸۔

(۲) نفحات الانس مولانا جامی ص ۵۷۔ طبع اصفہان ایران ملک۔ مرتب۔

(۳) حافظ حبیب سندھی مضمون "گکرالہ"، روزنامہ جنگ مہران رنگ کراچی ۱۶-۱-۱۹۸۵ء

(۴) رسول بخش تمیمی مضمون "گکرالہ"، ماہنامہ نئی زندگی حیدرآباد جنوری فروری ۱۹۸۴ء

میاں میر سندھی

حضرت میاں میر قدس سرہ خاندان قادریہ میں شیخ خضر سیوستانی کے مرید اور خلیفہ تھے یہ شیخ خضر کوہ سیوستان (سیوہن سندھ) میں سکونت رکھتے تھے ان کا انتقال ۹۹۴ھ - ۱۵۸۶ء میں ہوا تھا۔ آپ صاحب کشف و کرامت اور عارف باللہ تھے۔

میاں میر کے والد کا نام قاضی سائیں ڈنا اور والدہ کا اسم مبارک فاطمہ بنت قاضی قادن تھا۔ آپ کا تولد ۹۵۷ھ - ۱۵۴۹ء میں سندھ کے تاریخی شہر سیوستان (سیوہن) میں ہوا تھا۔ آپ نے طریقہ قادریہ کی تلقین عرفان اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی اس کے بعد والدہ کے ارشاد پر پیر و مرشد کی تلاش میں نکلے۔ آخرکار کوہ سیوستان میں آپ کی ملاقات شیخ خضر سے ہوئی اور چند برس ان کی خدمت میں رہ کر تکمیل ولایت کو پہنچے پھر لاتعداد فیوض کے حصوں کے بعد حسب اجازت پیر روشن ضمیر سیوہن سے لاہور روانہ ہوئے اس وقت آپ کی عمر اٹھائیس برس تھی۔

مشہور مغل شہزادہ داراشکوہ جو آپ کے معتقد اور مریدوں میں سے تھے اپنی تصنیف "سفینۃ الاولیاء" میں لکھتے ہیں "حضرت میاں میر بالا پیر قطب زمانہ، امام طریقت، واقف اسرار حقیقت، ظاہری و باطنی علوم میں یکتائے روزگار اور عارف کامل ہو گزرے ہیں۔ آپ ظاہری و باطنی حقیقت و قابلیت میں اتنا بلند مقام رکھتے تھے کہ بڑے سے بڑے فاضل شخص کو بھی ان کے سامنے مجال سخن نہ ہوتی تھی"۔

آپ کا طریقہ اوقات بسری یہ تھا کہ تمام رات بیدار رہتے تھے اس ریاضت میں حبس نفس اس حد تک حاصل کر چکے تھے کہ پوری رات چند دم میں گزار دیتے

تھے۔ آپ ایک توکل گزار بزرگ تھے چنانچہ ایک نقل ہے کہ ایک روز ان کے حقیقی بھائی اپنے آبائی وطن سندھ سے تشریف لائے۔ اتفاقاً اس روز میاں میر کے ہاں طعام وغیرہ کچھ نہیں تھا آپ اپنے بھائی کو اپنے ٹھکانے پر بٹھا کر وہاں سے نزدیک باغیچے میں چلے گئے اور بارگاہ کبریا میں دو زانو ہو کر التجا کی۔ میرے مولا! تجھ قادر لایزال پر میرا حال بخوبی روشن و عیاں ہے۔ مجھ غریب کے پاس اس وقت کچھ بھی موجود نہیں کہ مہمانداری کے لیے صرف کر سکوں۔ میرے پاس مہمان آگیا ہے اب میری لاج تجھ مالک کے ہاتھ میں ہے، تو ہی میرا بھرم رکھنے والا ہے۔

اسی اثناء میں حضرت کا ایک خادم دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ باہر ایک شخص خوانِ طعام لے کر آیا ہے اور آپ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غیر واقف شخص خوانِ طعام لئے ہوئے منتظر ہے۔ اس نے خوان آگے دھرا اور کہا "یہ طعام حسب درخواست جناب واہب بے منت نے آپ کے لیے مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ زرِ نقد بھی ہے اگر مطلوب ہو تو حاضر کر دوں"۔ آپ بصد شکر خوانِ طعام لے لیا اور فرمایا کہ یہی کافی ہے مزید کچھ نہیں چاہیئے۔

داراشکوہ اپنی ایک اور تصنیف "سکینۃ الاولیاء" میں لکھتے ہیں کہ جہانگیر بادشاہ اگرچہ اولیاء اللہ کا معتقد نہ تھا بلکہ ان کو اذیتیں پہنچاتا تھا لیکن حضرت میاں میر کی ذات سے ان کو ایک گونہ ارادت تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ جہانگیر نے لاہور سے آگرہ جاتے وقت آپ کو عریضہ لکھ بھیجا کہ میں نے آپ کا ذکر خیر سنا ہے آپ اگر میرے پاس آگرہ تشریف لائیں گے تو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھوں گا۔ آپ ان کے پاس آگرہ تشریف لے گئے۔ آپ نے کچھ روز وہاں ٹھہر کر ان کو پند و نصائح کی مجلس سے نوازا واپسی پر جہانگیر نے آپ سے کہا کچھ طلب

فرمائیں تو آپ فرمانے لگے "میں مانگتا ہوں مگر اس شرط پر کہ تم واقعی مجھے دو" جہانگیر نے جواب میں کہا "بسروچشم جو آپ فرمائیں گے مجھ کو بہ دل وجان قبول ہوگا" میاں میر نے فرمایا "آپ اس وقت مجھے جانے کی اجازت دیں اور وعدہ کریں کہ آئندہ مجھے ایسی تکلیف نہ دیں گے" جہانگیر نے بہ دل وجان قبول کیا اور آپ واپس لاہور روانہ ہوئے۔

آپ کی وفات بروز سہ شنبہ وقت نماز ظہر ساتویں ربیع الاول ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۶ء واقع ہوئی۔ عمر آپ کی اٹھاسی برس تھی۔ آپ ساٹھ سال لاہور میں سکونت پذیر رہے ملا فتح اللہ جو آپ کے ارادتمندوں میں سے تھے رحلت کے بعد آپ کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ اس کی نقل دارا شکوہ نے "سکینۃ الاولیاء" میں بھی درج کی ہے اور یہ اب تک حضرت میاں میر کے روضہ پر تحریر ہے۔

میاں میر سر دفتر عارفاں۔ کہ خاک درش اشک اکسیر شد
سفر جانب شہر جاوید کرد۔ ازیں محنت آباد دلگیر شد
خرد بہر حال وصالش نوشت۔ بہ فردوس والا میاں میر شد

(۱۰۴۵ھ)

آپ کا مقبرہ عالیہ غرب رویہ چھاؤنی سڑک میاں میر جو ریلوے اسٹیشن چھاؤنی سے ہوکر جاتی ہے اس پر واقع ہے۔ مقبرہ کے گرد ولواح چار دیواری ہے اس چار دیواری کے اندر ایک شاندار مسجد بھی موجود ہے۔

آپ تمام عمر مجرد رہے، شادی نہیں کی تھی اس لیے آپ کی صلبی اولاد نہیں ہوئی۔ چنانچہ آپ کی وفات کے بعد شہزادہ دارا شکوہ نے محمد شریف خواہر زادہ حضرت میاں میر کو سیوستان (سیوہن سندھ) سے طلب فرما کر سجادہ نشین مقرر کیا اور تمام عمارات وجاگیر متعلقہ مقبرہ معلیٰ اس کے سپرد کردیں۔ *

---

* اولیائے لاہور، مؤلف محمد لطیف ملک ایم اے، ص ۵۹ تا ۶۹ سے ماخوذ

قاضی قادن کی شاعری

قاضی قادن سمہ خاندان کے دور حکومت میں پیدا ہوئے جب یہاں جام نظام الدین ثانی عرف جام نندو سریر آرائے سلطنت تھے۔ ان کی ولادت ۸۷۰ھ-۱۴۶۳ء اور وفات ۹۵۸ھ-۱۵۵۱ء میں ہوئی۔ اس طرح وہ جام نظام الدین سے لے کر مرزا شاہ حسن ارغون کے دور حکومت تک زمانے کے نشیب و فراز دیکھ چکے تھے۔

سندھ کے تاریخی تذکروں میں عالم دین کی حیثیت سے ان کی جتنی اہمیت بتائی گئی ہے شاعری کے اعتبار سے ان کا اتنا اہم ذکر کہیں نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ ان کے چند ابیات مختلف روایتوں کے ذریعے بیان کئے گئے ہیں لیکن وہ بھی ان کے ناپسندیدہ سیاسی کردار کی وجہ سے اس طرح درگزر ہوتے رہے جیسے کہ ان کے تھے ہی نہیں۔

تقریباً دس برس پہلے (۱۹۷۸ء) میں بھارت کے ایک نوجوان سندھی ادیب، ہیرو ٹھاکر نے قاضی قادن کا کلام دریافت کر لیا جسے وہ تفصیلی مقدمات کے ساتھ وہاں سے شائع کرا چکے ہیں۔ ان کا ترتیب دیا ہوا قاضی قادن کا یہ کلام جب یہاں سندھ میں پہنچا تو ان کے مبہم نام کا مسئلہ از سر نو سامنے لایا گیا کہ اصلی نام قاضی قادن ہے یا قاضی قاضن ہو سکتا ہے جیسا کہ برسوں سے یہاں مشہور و معروف تھا۔ آخر کار طے ہوا کہ ان کا نام قاضی قاضن کے بجائے قاضی قادن ہونا چاہیئے جو عبدالقادر یا قادر داد کا مخفف ہے۔

ہمارے بزرگ ادیبوں، عالموں نے یہ فیصلہ تو آسانی سے کر لیا کہ قاضی موصوف کا نام قاضی قاضن کے بجائے قاضی قادن ہونا چاہیئے مگر ان کی نئی دریافت

شدہ شاعری اور پرانے ابیات کا موازنہ کرنا کسی کو یاد ہی نہ رہا۔ حالانکہ دونوں میں دن رات کا فرق موجود ہے۔ یہاں زیادہ بحث و تکرار میں جانا مقصود نہیں گزارش صرف یہ ہے کہ قاضی موصوف کے نام کی صفائی کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ کلام کسی ایک شاعر کی محنت کا نتیجہ ہے یا اس کے دونوں حصے دو الگ الگ شاعروں کی کاوش کا ثمرہ ہیں اس بارے میں پہلے قاضی موصوف کے نام کو لیتے ہیں۔

قاضی موصوف کا یہ مبہم نام جو بار بار تاریخی تذکروں میں دہرایا گیا ہے اس لیے ان کی ذات سے منسلک رہا کہ وہ جام نظام الدین سے شاہ حسن ارغون تک طویل عرصہ قاضی القضات رہ چکے تھے اس لیے لوگوں نے اسے قاضی القضات کہنے یا لکھنے کے عوض بطور تخفیف قاضی قاضن یعنی قاضیوں کا قاضی کہنا اور لکھنا شروع کر دیا جو اب تک زبان زد عام ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ناپسندیدہ سیاسی کردار کے باعث لوگوں نے از راہ تمسخر ان کا یہ نام تجویز کیا ہو جیسا کہ عام طور پر یہاں ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ عبدالقادر یا قادر داد کا مخفف قادن کے بجائے (جو آج بھی سندھ میں رائج ہے) خواہ مخواہ بگاڑ کر قاضن مشہور کیا جائے جبکہ اسی نام کی نسبت عرب کے کسی عالم سے ہو۔

اب یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اسی قاضی قاضن کے پردادا قاضی قادر داد عرف قاضی قادن کے نام سے بارہویں صدی عیسوی میں ہو گزرے تھے جیسا کہ سلسلہ نسب میں واضح کیا گیا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کا تعلق سرزمین اوچ سے تھا جہاں اوائل ۴۸۳ھ۔ ۱۰۹۱ء میں سومرہ خاندان، محمود غزنوی کے خاندان کے زوال کے بعد قرامطہ کی مدد سے برسرِ اقتدار آچکا تھا۔ آگے چل کر جب شہاب الدین غوری نے ۵۷۱ھ۔ ۱۱۷۶ء میں اوچ اور ملتان پر لشکرکشی کی تو قرامطہ

شکست کھا کر منتشر ہو گئے ساتھ ہی سومرہ خاندان وہاں سے نکل کر سندھ کی جانب چلا آیا۔ خیال ہے کہ اسی زمانے میں قاضی قادر داد عرف قاضی قادن کا خاندان وادہ جس کے سربراہ قاضی ابوالخیر تھے اوچ سے نقل مکانی کر کے سندھ میں وارد ہوا ہوگا۔ یا وہ تبلیغ کے سلسلے میں یہاں آکر پھر ہمیشہ کے لیے آباد ہو گئے ہوں گے۔

تحفتہ الکرام میں لکھا ہے کہ قاضی قاضن کے جد امجد اور قاضی قادن کے والد قاضی ابوالخیر اوچ کے بزرگوں میں سے تھے اس زمانے میں اُوچ کی سرزمین صوفیوں اور ولیوں کی آماج گاہ تھی اس سرزمین کو تصوف کی سرگرمیوں کے لیے ایک مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں سے سندھ و پنجاب اور دیگر علاقوں میں تصوف کی تبلیغ کے لیے صوفیوں اور ولیوں کی آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔

قاضی ابوالخیر کے متعلق تحفتہ الکرام میں بتایا گیا ہے کہ یہ نیک خصلت اور صاحب فضیلت بزرگ تھے ان کی سکونت بکھر (سندھ) میں رہی اور وہیں رحلت کر گئے تھے۔ ان کے پسماندگان میں سے بعض حضرات ٹھٹھہ اور سیوہن میں بھی رہ چکے تھے جیسا کہ تحفتہ الکرام میں قاضی قاضن کو کئی بار سیوستانی کہا گیا ہے۔ ممکن ہے بکھر آنے سے پہلے وہ سیوہن میں بھی رہ چکے ہوں۔ یہ بات کئی جگہ ثبوت کے ساتھ موجود ہے کہ بعض صوفیوں نے تصوف کی تبلیغ کا سلسلہ شعر و شاعری کے سہارے شروع کیا تھا جیسا کہ برصغیر میں آغا خانی بزرگوں کے لیے مشہور ہے۔ اسی طرح قاضی قادن اور قاضی قاضن دونوں نے اس مقصد کی بنا پر شاعری کو تصوف کی تبلیغ کے لیے اپنایا تھا اور یہی شاعری آج ہمارے ہاں موجود ہے۔

ان میں سے قاضی قاضن جو کہ پندرھویں، سولھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں ان کے سات ابیات زبان و بیان کے اعتبار سے فصیح بلیغ اور سادہ و

سلیس ہیں لیکن ان کی بہ نسبت قاضی قادن جو اس سے پیشتر بارہویں صدی عیسوی میں ہو گزرے تھے ان کی شاعری جو اس دور میں بھارت سے دستیاب ہوئی ہے ہر حال سے دقیق دوسری زبانوں سے مخلوط اور غیر مانوس زبان و بیان سے بھری ہوئی ہے یہاں تک کہ اس پر سندھی شاعری ہونے کا یقین بھی مشکل سے آتا ہے۔ اس شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ اور اُوچ کی وطنیت اختیار کرنے کی صورت میں قاضی قادن نے زبانوں کا اثر و تاثیر بھی قبول کر لیا تھا چنانچہ ان کی شاعری میں سندھی کے ساتھ ساتھ سرائیکی اوچی یا ملتانی، ہندی گجراتی زبانیں خلط ملط ہو گئیں تھیں۔ زبانوں کی یہی آمیزش اسی قاضی قادن کے قریبی دور کے بزرگ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر ۱۱۸۸ء۔۱۲۶۶ء کی شاعری میں بھی عام ملتی ہے جو اسی طرح سندھی سرائیکی گجراتی اور ہندی زبانوں کا آمیزہ ہے۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر ملتان کے ایک نواحی گاؤں کوٹھوال میں پیدا ہوئے تھے آپ کے اشعار یا دوہے ٹھیٹھ ملتانی یا سرائیکی زبان میں ہیں۔ سات سو برس پہلے کی یہ زبان اُوچ کی موجودہ زبان سے مختلف نہیں ہے نیز اس کا انداز ہندی بھی ہے۔

قاضی قاضن کے متعلق ان کے قریبی مؤرخ میر معصوم لکھتے ہیں کہ وہ حافظ قرآن تجوید کے ماہر حدیث تفسیر اور اصول فقہ کے عالم تھے۔ وہ تصوف سے باخبر، سلوک اور طریقت میں بہت سی ریاضتیں کر چکے تھے۔ سید محمد جونپوری (میراں مہدی) کے مرید تھے اور آخر میں مدینہ منورہ جا کر فوت ہوئے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قاضی قاضن اس حیثیت میں جبکہ وہ ایک دینی عالم تھے اور مہدی جونپوری جیسے دینی مبلغ اور مسلم سیاست کے محرک کے ساتھ ان کے مریدانہ روابط تھے ان کا کلام کس طرح غیر مسلم حلقوں تک جا پہنچا اور مسجدوں یا مدرسوں

کے عوض مندروں میں محفوظ رہا۔؟

دوسری بات یہ کہ تحفۃ الکرام اور تاریخ معصومی کے مطابق قاضی قاضن زندگی بھر تو مومن اور متقی رہے اور آخر میں مدینہ منورہ جاکر فوت ہوئے تو وہ پھر کیوں قدوری کافیہ روزہ، عید نماز سے لےکر مکہ اور ملا تک باغی ہوگئے جیساکہ ان کے کلام سے واضح ہے۔ اس سے بھی اہم تیسری بات یہ کہ وہ درباری قسم کے آدمی تھے اور مرزا شاہ بیگ ارغون جیسے غاصب حکمران کی سرپرستی اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے رہے اس غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حدیث کے مطابق افضل ترین سچ وہ ہے جو ایک ظالم حکمران سے کہا جائے۔!

ایک روایت کے مطابق سندھ پر فوج کشی کے دوران بکھر کی جانب شاہ بیگ ارغون کے کارندے میر فاضل کے سامنے جب دھاریجہ قوم کے باغی سرداروں نے ہتھیار ڈال دیئے تو وہ ان کو حراست میں لےکر شاہ بیگ کے پاس لائے۔ شاہ بیگ نے قاضی قاضن سے پوچھا ان کے لیے کیا سزا ہونی چاہیئے۔ قاضی قاضن نے فی الفور مشورہ دیا کہ سب کو قتل کیا جائے جس پر اسی وقت عمل کیا گیا۔

ہمیں یقین ہے کہ اس قسم کا آدمی جو عملی طور پر اتنا سنگدل اور سفاک تھا کبھی انسان دوست شاعر ہو نہیں سکتا۔ جہاں تک اس ایک شعر یا بیت کا معاملہ ہے جو قدوری کافیہ سے روگردانی کے بارے میں قاضی قادن کے کلام کے علاوہ قاضی قاضن کے سات ابیات میں بھی موجود ہے، یہ بیت دراصل قاضی قادن کا ہے جو غلطی سے قاضی قاضن سے منسوب کیا گیا ہے۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ صورتحال سامنے آتی ہے کہ قاضی قاضن کے جو سات ابیات پہلے سے اُن کے نام سے مشہور و معروف ہیں ایک بیت کے سوائے ان کے ہیں اس ایک بیت کے متعلق مندرجہ بالا سطور میں تبصرہ ہو چکا ہے۔

ان کا دوسرا بیت جس میں کہا گیا ہے کہ لوگ نحو وصرف میں محو ہیں اور ہم رُخِ یار کے مطالعہ میں معروف۔ یہ شیخ سعدی کے اس بیت کا سرقہ ہے جو گلستان سعدی میں یوں درج ہے۔

اے دل عشاق بہ دام تو صید ـــ ما بہ تو مشغول و تو با عمرو زید

باقی ابیات بھی بقول بعض، شاہ کریم وغیرہ کے ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ مثال موجود ہے کہ کبھی کبھار بہت بڑے عالم بھی کچھ اشعار کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ابیات اگر قاضی قاضن کے ہیں بھی تو مضائقہ نہیں۔ قاضی قادن جن کے ایک سو بارہ ابیات بھارت سے دستیاب ہو چکے ہیں تصوف کے مسلک اور مقصد کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔ یہ شاعری اس دور کی پیداوار ہے جب چاروں طرف ایک ہی مذہب کے ماننے والے بخصوص مسلمان ایک دوسرے سے آمادہ پیکار تھے یا غیر مسلم قوتوں سے ان کا تصادم تھا۔ بظاہر تو یہ مسئلہ کفر والحاد کی شکست اور دین کی فتح و نصرت کے لیے کھڑا کیا گیا تھا مگر درپردہ اس جذبے میں زراندوزی اور جاہ طلبی کا عنصر بھی موجود تھا جیسا کہ تاریخی کتب میں مرقوم ہے۔ بہر حال یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے المناک نتیجے میں عوام الناس دن بہ دن معاشی اور معاشرتی ابتری کا شکار ہو کر تباہ ہوتے جا رہے تھے ان نامساعد حالات میں لوگوں کے مادی مسائل ایک طرف تو روحانی مشاغل دوسری جانب بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ وہ جنت نظیر کائنات جو بنی نوع انسان کی دینی و دنیوی بہتری اور بہبودی کے لیے معرضِ وجود میں لائی گئی تھی اسے اس طرح چند نفوس کی وحشیانہ اور حریصانہ حرکتوں کی بناء پر جہنم کدہ بنتا ہوا دیکھ کر اہلِ دل صوفی داعی انقلاب ہو کر سرِ میدان نکل آئے تھے، یہ بازگشت قاضی قادن کی شاعری میں اس طرح سنائی دیتی ہے۔

طوفانوں کی زد میں آکر، کشتی ٹوٹ چکی ہے تو
تو ہے حوالے موجوں کے اتری قسمت پھوٹ چکی ہے تو
رکھ تو بھروسہ اپنے آپ پے، ہمت ہار نہ تو
زور لگالے بازوؤں کا، اور کسی کو پکار نہ تو

قاضی قادن کی پوری شاعری اسی مسلک اور معیار کی شاعری ہے وہ وحدت الوجود اسلامی پر انسان دوستی کے اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے پوری انسان ذات کا دکھ اپنا دکھ سمجھتے ہوئے اظہار بیان کرتے تھے۔ جیسا کہ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند | کہ در آفرینش ایک جوہر اند
چو عضوی بدرد آورد روزگار | نماند دگر عضو ہارا قبرار

قاضی قادن کو معلوم تھا کہ اگر انسان میں ایسا احساس نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں اور اس کچھ ہونے کی صورت میں آخر یہی ہوتا ہے کہ۔

ایسا بھی ہوتا ہے جو پنچھی پانی ہی میں رہتے ہیں
کبھی کبھار وہ پیاس کے مارے پانی میں ہی مرتے ہیں
تیری بھی جو سمجھ میں آئے، یہی انوکھا بھید میاں!
تو بھی ہو آزاد رہے نا، یونہی جہل میں قید میاں!

پھر چیتاونی دیتا ہے کہ دنیا کے سارے میلے ٹھیلے محض سادہ دلوں کو لوٹنے کے لیے برپا کئے گئے ہیں۔

منڈیوں میں اور محلوں میں موجود ہیں سودے بازیہاں
سادہ دلوں کو لوٹیں پھر بھی بنے رہیں دمساز یہاں
سب سے ان کا رشتہ ناتا، سب کو دوست بناتے ہیں
دھوکہ پیشہ ہے ان کا یہ اس سے کام چلاتے ہیں

اس کے ساتھ ہی کڑی طنز کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دینے پر مجبور ہوتا ہے کہ:۔

سوئے ہو مُنہ ڈھانپ کے ساری رات کہ جیسے میّت ہو
پڑے رہے بے حال کہ گویا، اُٹھنے کی نہ کوئی نیّت ہو
جینے کی تجھے فکر نہیں کیوں، اور دیوانے جاگ ذرا
کیا ہو گا انجام ترا، اُٹھ او انجانے جاگ ذرا

ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ اگر تمام انسان جو ظلم وستم کی چکی میں بیک وقت ظالم اور جابر قوتوں کے ہاتھوں پس رہے ہیں تو ان کو اپنے جیسے اور دکھیوں کے ساتھ مل کر آگے بڑھنا چاہیئے ورنہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا پھر مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

دونوں جھیل میں رہتے ہیں، جو میل نہیں تو ملتے نہیں
کنول کے پاس نہ جائے مینڈک، دونوں اکٹھے ہوتے نہیں
کنول سے واقف ہو جائے جو مینڈک جھیل رہتے ہوئے
کبھی نہ مٹی کھائے وہ، پاتال میں مارے پھرتے ہوئے

حق وصداقت کی صدائیں بلند کرتے ہوئے باطل پرست قوتوں سے ٹکرانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

دھرتی کی مانند سہیں جو دھونس، ہلیں نہ ہلانے سے
پربت جیسے بھاری ہوں اور کھسک سکیں نہ ٹھکانے سے
ایسے ہی دل والوں اور دیوانوں سے رکھ پریت اپنی
ان کی طرح ہی مہر و وفا کو بنا لے جگ میں ریت اپنی

آخر میں ان کے ایک بیت کا عکس جو انسان میں خود اعتمادی کے جذبے کو ابھارتا ہے۔

تیرے اندر جلوہ اس کا، پھر بھی یوں انجان ہے تو
نیند سے جاگ کے دیکھ ذرا، کیوں بے سدھ اور بے جان ہے تو

یہیں پہ ہے موجود وہ جس کی جگ مگ جلوہ نمائی ہے
یہیں پہ مکہ یہیں پہ ملتان، یہیں پہ ساری خدائی ہے

صاحب ضمیر شاعر کی شاعری اس کے اعلیٰ کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے یہ وہ نعمت ہے جو کسی نام نہاد قسم کے شاعر کو نصیب نہیں ہوتی اگر یہی قاضی قادن ارغونی دور کے قاضی قاضن کی طرح ہوتے تو ان کی شاعری اتنی اچھی اور اتنی اونچی کبھی نہ ہوتی۔

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں — گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی

—————— نیاز ہمایونی

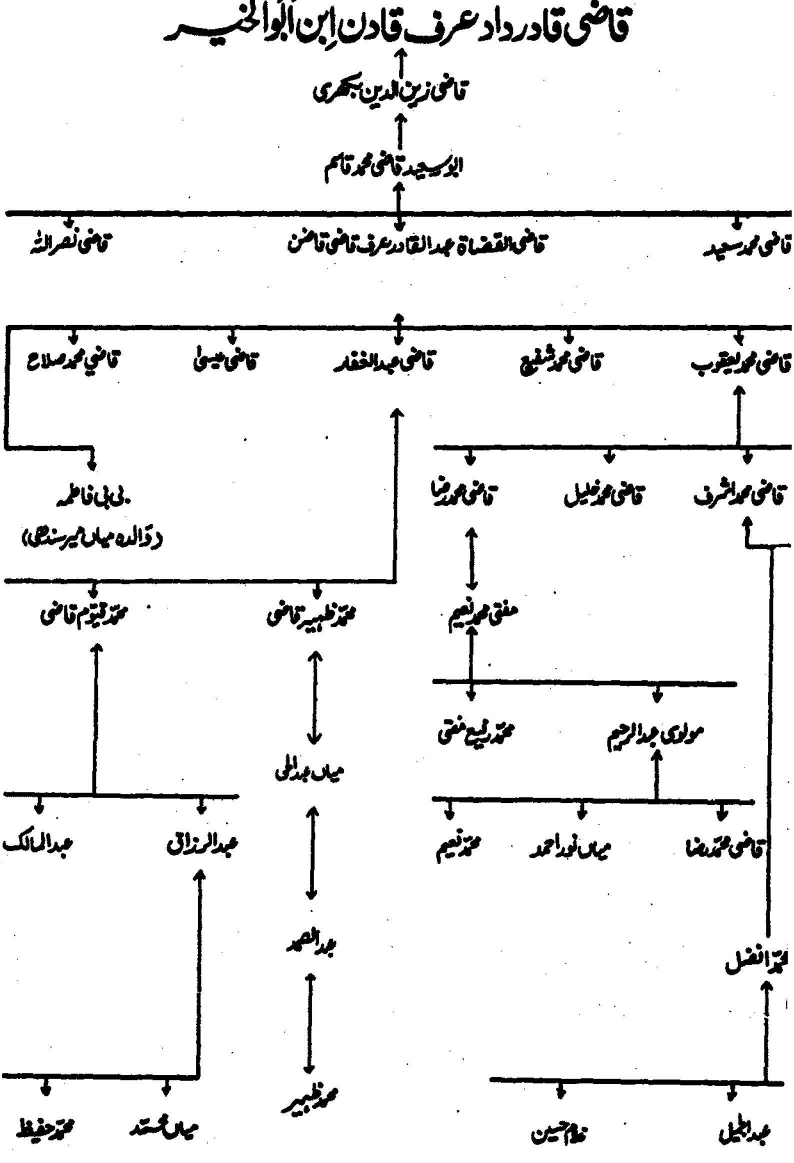
"خطۂ پاک اُوچ" مسعود حسن شہاب ص ۱۱۷ — ۱۲۰۔ اُردو اکیڈمی بہاولپور
"فکر فرید" سلیم یزدانی پچھمی محراب
"تحفۃ الکرام" سندھی ترجمہ مخدوم امیر احمد صاحب سندھی ادبی بورڈ
"تاریخ معصومی" فارسی متن میر معصوم بکھری ۲۰۰-۲۰۲۔ سندھی ادبی بورڈ
"تاریخ مظہر شاہجہانی" سندھی ترجمہ نیاز ہمایونی ص ۱۳۱۔
"تاریخ فرشتہ" جلد اول ترجمہ عبدالحی خواجہ ص ۱۲۷-۱۵۳-۱۵۴ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

سلسلہ نسب معہ تفصیل

سلسلہ نسب قاضی قادرداد عرف قادن

بارہویں صدی تا اٹھارویں صدی عیسوی

احمد شاہ ابدالی کے دور تک



سلسلۂ نسب کے بارے میں تفصیل

ابو سعید قاضی محمد قاسم ایک نامور شخص تھے جو اپنے دور میں صاحب فضیلت رہے آپ کے تین بیٹے محمد سعید، عبدالقادر عرف قاضی قاضن اور قاضی نصراللہ ہوئے۔ قاضی قاضن بلند درجہ عالم اور سالکانِ طریقت میں سے تھے۔ اس کے چار فرزند محمد یعقوب، شفیع محمد، عبدالغفار اور محمد صلاح بتائے جاتے ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق ان کا مزید ایک بیٹا قاضی عیسٰی اور ایک بیٹی بیبی فاطمہ (والدہ میاں میر ندھی) بھی معروف ہیں۔

محمد یعقوب بکھر میں شاہی مفتی کے عہدے پر رہ کر فوت ہوئے۔ اس کے تین بیٹے محمد اشرف، محمد خلیل اور محمد رضا تھے۔ محمد اشرف نہایت خلیق انسان تھے انہوں نے زندگی کا بیشتر حصّہ دہلی میں بسر کیا، خوشنویسی میں اپنی نظیر آپ اور شاعری میں کامل اُستاد ہو گزرے۔ آپ کا تخلص بہجت تھا۔ ایک رنگین دیوان بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے فرزند محمد افضل ٹھٹھہ میں اہلِ علم مشہور تھے۔ کچھ عرصہ شاہی خزانچی بھی رہ چکے تھے۔ آپ کے بھائی محمد رضا کے اچھے نصیب تھے ہمیشہ اچھے عہدوں پر فائز رہتے آئے۔ اس کا لڑکا محمد نعیم مفتیوں کے سلسلے میں مشہور و معروف تھا۔ آپ کے بیٹے مولوی عبدالرحیم باپ کی زندگی میں یورپ کے سفر پر گئے وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ٹھٹھہ واپس آئے جہاں مشہور علماء میں ممتاز رہے۔ ان کے تین لڑکے قاضی محمد رضا، میاں نور احمد اور محمد نعیم ہوئے۔

مفتی محمد نعیم کے دوسرے بیٹے محمد رفیع جہان آباد میں سکونت پذیر ہو کر خانی کے خطاب سے سرفراز ہوئے، احمد شاہ ابدالی کی یورش کے بعد راجپوتانہ چلے گئے

تھے لیکن دوبارہ شاہی وکیل کی حیثیت سے یہاں واپس آکر ٹھٹھہ میں مقیم ہوئے آپ بزرگی اور تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھے چند برسوں کے بعد اپنے بھائی عبدالرحیم کی جگہ مفتی کے عہدے پر مامور رہ چکے تھے۔

محمد یعقوب کے تیسرے فرزند قاضی محمد خلیل، مخدوم حامد کی اولاد قاضی ابوالبقا کی رشتہ داری کے سبب کچھ عرصہ تک گرھوڑ میں مفتی کے عہدے پر رہے بعد ازاں جہان آباد جاکر آباد ہوئے۔ قاضی قاضن کے دوسرے بیٹے عبدالغفار کو بحر العلوم ہونے کے باعث الا العلماء کا لقب عطا ہوا جو بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرتا رہا آپ کے دو لڑکے محمد ظہیر اور محمد قیوم تھے۔ محمد ظہیر فاضل کامل ہونے کی وجہ سے پہلے ٹھٹھے میں قضا اور صدارت کی مسند پر رونق افروز رہے اس کے بعد لاہور جاکر مفتی مقرر ہوئے۔ پھر یہاں آکر شان وشوکت کے ساتھ اورنگا بندر میں قضا اور احتساب کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ ان کا انتقال لاہور میں ہوا تھا۔ درسی کتابوں پر ان کے بعض حاشیے اب تک یادگار ہیں۔ اس کا بیٹا عبدالحی مشہور عالم دین تھا جو ٹھٹھہ میں فوت ہوا اس کا لڑکا عبدالصمد بھی وہیں رہ کر وفات پا گیا۔ لیکن اس کا بیٹا محمد ظہیر جہان آباد چلا گیا تھا۔

عبدالغفار اسد العلماء کے دوسرے فرزند محمد قیوم مشہور و معروف شخصیت کی کی حیثیت میں اس جہان فانی سے گذر گئے۔ اس کے دو لڑکوں میں سے عبدالرزاق اپنے دونوں بیٹوں میاں محمد اور محمد حفیظ سمیت سورت بندر میں رہ کر دنیا سے کوچ کر گئے۔ عبدالرزاق کا بھائی عبدالمالک کافی دنوں تک ٹھٹھہ میں مفتی کے عہدے پر رہ چکا تھا۔ جب نادری دور (۱۷۴۰ء) آگیا تب بھی اسی طرح ملازمت کے فرائض سرانجام دیتا رہا تا آنکہ رحلت کر گیا۔

قاضی قادن کے ایک لڑکے قاضی عیسیٰ کے متعلق روایت ہے کہ سال ۹۵۰ھ۔

۱۴۵۴ء میں جب بخشو لانگاہ نے بکھر پر شب خون مارا تو یہ (قاضی عیسٰی) میر جانی ترخان اور حمزہ بیگ کی ہمراہی میں مقابلہ کرتے ہوئے جانبازی کے جوہر دکھا چکے تھے، آخرکار بخشو لانگاہ بے نیل و مرام بکھر سے واپس ہو گیا۔

جناب کریم بخش خالد بحوالہ "تاریخ معصومی" ماہوار پیغام کراچی اپریل ۱۹۷۹ء
نیز "تحفتہ الکرام" سندھی ترجمہ مخدوم امیر احمد صاحب ص ۳۴۵ تا ۳۴۵

ترجمہ متن کے ساتھ

ترجمہ متن کے ساتھ

بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ

١

ڙيران ڙبران آيتان ۾ آکر انت نه چار
هيڪڙ ييو ايمان ۾ لهن سينئي سار

ایسے تو الفاظ بہت اور ان کے ہیں انداز بہت
لیکن ایک ایمان ہے کافی جس کے ہیں اعجاز بہت
جس کا ہے ایمان مکمل، کامل ہے انسان وہی
آساں ہے ہر مشکل اس کی، ہر جا ہے ذیشان وہی

۲

جو جو بار نه لک، کوڙين ڪتابن جي پڙهيءَ
اي سپاهي سڪ، جان جان پرين نه پڙهيءَ

ہو کر اپنی دُھن میں مگن، تم لاکھ کتابیں پڑھتے ہو
لیکن یہ تو بتاؤ ان سے کوئی سبق بھی لیتے ہو
رکھنا یاد کہ ان سے کوئی لابھ نہ پاؤ گے تب تک
اپنے تئیں اس یار کے ہاں تم پہنچ نہ جاؤ گے جب تک

۳

ڪنز قدوري، ڪافيه ڪيڪين پڙهيام
سو ڌيهه ٿي ڪو هيو، جٿان پرين لڌام

کنز قدوری کافیہ پڑھتے اپنی عمر تمام ہوئی
کچھ بھی پڑھنے سے نہیں پایا، ہر کاوش ناکام ہوئی
وہ تو کوئی اور نگر ہے جہاں سپے ساجن بستے ہیں
کٹھن ڈگر کو پار کریں جو اس سے وہی جا ملتے ہیں

٤

پڙهند پڙهي ويو، ڪوڙين لک قرآن؛
لکي لوڪ نه سگهيو، پاڻي اندر پاڻ.

لاکھوں بار توجہ سے قرآن پڑھا ہے لوگوں نے
اور اس زعم میں جیسے بڑا ہی، کام کیا ہے لوگوں نے
لیکن اکثر ان میں سے، اک ذرہ بھی نا جان سکے
اور نہ اپنے آپ کو ایسے پڑھنے سے پہچان سکے

٥

جي گهر گهڙي نه ڪينهه، سائين تو ديدار ڪي
ڪيهي حُج ڪرينهه، سودي پهچون ٻ ڏانهن

عشق نہیں تجھے درد نہیں، کوئی زحمت نے اٹھائی نہیں
وصل کی دولت پائی نہیں، تُو نے ہجر کی ٹھوکر کھائی نہیں
ترا دِل ہے کالے پتھر کا، نہیں جس میں زیست کی گرمی کچھ
ترے بھاگ میں باقی رہ گئی ہے، بوالہوسوں سی خوش فہمی کچھ

٦

سُتو ويٺو، اٿيو، ڳالهائيندو ٻڌندو،
اسان تسان جي تاتڙي، واتڙين ويندو.

سویا ہوں یا بیٹھا ہوں یا چلتا پھرتا رہتا ہوں
کھاتا پیتا رہتا ہوں یا جو کچھ کرتا رہتا ہوں
میرے داتا میرے دھنی میں تیرا دم بھرتا ہوں
تیرے ہی گن گاتا ہوں اور تیری باتیں کرتا ہوں

۷

اکر پیا وسار، الف اُگھون ئي ياد کر
سو تون ڏيئو ٻار، جو نہ اجهنيءَ ڪڏهن

سارے لفظ بھلا دے دل سے ایک الف کو دھیان میں رکھ!
یہی ہے سب کچھ اس کے سوا کچھ اور نہ وہم و گمان میں رکھ!
دیا وہ روشن کر تو یہاں جو کبھی نہ بجھنے والا ہو۔
چاروں اور چمک ہو تیری، بول بھی تیرا بالا ہو۔

٨

لائي لام الف سين ڪاتب لکن جيئن
مون هينئڙو پرين سان، لڳو آهي تئين

لام الف کو ملا کر جیسے، قلم سے کاتب لکھتے ہیں
لا کے اچار میں اس کو جیسے پڑھنے والے پڑھتے ہیں
ایسے ہی دل اپنے یار کے، عشوؤں میں مجوس ہوا
ایک ہوئے ہم، ایک ہی تھے ہم، ایسا ہی محسوس ہوا

٩

جان پاڻ ڄُو پَڌرو، پڌو آءُ سڏ
مون هينئڙو تان ٿي ڪيو، سپريان سڻون گڏ

صدا تھی اپنے ساجن کی جو اپنے دِل سے نکلی تھی
اُس کا خطاب ہمیں سے ہی تھا، ہم نے حقیقت سمجھی تھی
جس دن کو یہ صدا سنی، ہم اس دن اس پہ فدا ہوئے
ساجن سے یوں ملے کہ ایک، کبھی نہ اس سے جُدا ہوئے

١٠

پھر يون ٿي پر يانمجا، مون سان ٿي سوڙان
هينئڙو هيج پنڌ ڪري، لڳو ڪهڪيٽان

ساجن کے احسان ہزاروں، مجھ پے شروع سے آخر تک
اس کا جو احسان نہ مانوں، ہو جاؤں میں کافر تک
جبھی تو دِل دیوانہ اس کا، اس کے دوارے ہوتا ہے
کر کے ترک تعلق سب سے، اس پے ہی مرمٹتا ہے

١١

نہ سولاھو نہ سرو، نہ اُرِ وار نہ پار
موٽ ھو وتين تن کي، سو من منجھ نھار

نہیں تیرا محبوب کہیں ان دور اور نزد کے چکروں میں
بھول بھلیاں ہیں یہ سب تو پڑ، نا ایسی فکروں میں
تیرے من کو کھوج ہے جس کی اس کا بسیرا تجھی میں ہے
اندھیاروں میں بھٹک نہ، مڑ کر دیکھ سویرا تجھی میں ہے

١٢

دل اندر درياءُ، پڇهءِ ڪيا نسھندر ڳل
ماڻڪ اِهِ سرياءُ، چڱي چوڪي نہ ڪٽي

دِل میں سمندر موجیں مارے، اور تو گھو سرابوں میں
باز آ، ایسی بازی سے، کیوں بھٹک رہا ہے خرابوں میں
موتی ہیں موجود یہاں پر، یہیں سے دامن بھر لینا
یہاں سے باہر کچھ بھی نہیں ہے، دھیان یہیں پر دھر لینا

۱۳

ڪايامھ ڏيئي، پيتا جي دريا ۾
پسندا سيئي، ماڻڪ اکڙين سين

دِل کی آنکھیں روشن کرکے، اتریں جو دریاؤں میں
سمٹ کے آئیں سارے موتی، ان ہی کی کٹیاؤں میں
دریا جیسا عشق اگر یہ عشق مکمل تجھ میں ہے
تیرا مقصد تیری مراد اور تیری منزل تجھ میں ہے

۱۴

ڏر چورا ڳہ سي ڳهران ۽ حقيقتا هنجهه
ڪوڙين هنڌان ڪڻ چڳن ۽ سرباڻي جي منجهه

ایسا جوگی چاہوں جس سے آنند آئے تن من کو
قدم دھرے تو گلشن کر دے، گھر کے اجڑے آنگن کو
ایک بسیرا ہو اُس کا پر ساگر ساگر پھیرا کرے
جہاں سے جیسا منکا پائے، کنٹھ اسی سے بھرا کرے

۱۵

وڃي آيو ڪير، ڪنهن ڏٺو مهه لاهوتين
آچي ڪندو ڪير، ڳالهيون ڙب پرتيان

جا کے واپس آیا کون، اس دنیا سے جو چلا گیا
اس کا لوٹ کے آنا مشکل، چلا گیا، سو چلا گیا
جانے والوں کا ہے باقی، اب نہ زمان و مکان یہاں
کون کرے گا اگلے جہاں کی، باتیں آ کے بیان یہاں

١٦

هن سَر سندا هنجهڙا، اتي اِي آهين
ڳالهين رب پر تيان، جو منگي سو ڏين

جگ کو سنواریں جو سامی وہ جگ میں ہیں آباد ابھی
گھوم رہے ہیں نگر نگر اور گلی گلی آزاد ابھی
ان سے جو بھی مانگے گا وہ ان کا دامن بھر دیں گے
سارے بھید ہیں ان کے پاس جو پوچھے ظاہر کر دیں گے

۱۷

سَر هيڪڙي وَسنِ، جَنِ ۾ نيهن نه گڏيو
سار نه سانورن، مٿي ڪنول ڦلاڙيو

ایک ہی جھیل میں رہتے ہیں، پر اس کو اُس کی خبر نہیں
مینڈک ہے گم مٹی میں، اسے کنول پہ کوئی نظر نہیں
ایک ہی جھیل میں رہتے ہوئے کیا ایک ہی ہو سکتے ہیں وہ
کشش نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے اس لیے اجنبی رہتے ہیں وہ

١٨

جي سالو ۽ وسُـڏ لهي، ڪنولان سنديڪاءِ
تو پيو پاتال ۾، هـونـد نـه مـڻـي ڪاءِ

دونوں جھیل میں رہتے ہیں، جو میل نہیں تو ملتے نہیں
کنول کے پاس نہ جائے مینڈک، دونوں اکٹھے ہوتے نہیں
کنول سے واقف ہو جائے جو، مینڈک جھیل میں رہتے ہوئے
کبھی نہ مٹی کھائے وہ، پاتال میں مارے پھرتے ہوئے

١٩

ڪو ويجهائي ڏور، ڪي ڏوري ٿي ولها
هوئي جن سالور، لڌي نه ڪولانهه ڪر

کوئی نزد بھی دور اور کوئی پرے بھی نزد اور پیارا ہے
قرب اور بعد کا یہ عالم، اک مثل نے خوب سنوارا ہے
مینڈک ہے پاتال میں گم، اور مٹی پر ہے گزر اس کا
کنول کی چشمک سے ہے غافل، تاریکی میں سفر اس کا

۲۰

اِکـ اندرہ سرِیو ، جـاگِـي پـس حُبـواٹ
منـجھيٹی مکوتیو ، منجھيٹي ملتان

تیرے اندر جلوہ اس کا، پھر بھی یوں انجان ہے تو
نیند سے جاگ کے دیکھ ذرا کیوں بے سدہ اور بے جان ہے تو
یہیں پہ ہے موجود وہ جس کی جگ مگ جلوہ نمائی ہے
یہیں پہ مکہؔ یہیں پہ ملتاں یہیں پہ ساری خدائی ہے

۲۱

اکيون آکا سانهه، فوجون ڪري لٿيون
سوڙهي گلي منجهانه سوجهي پرين لهنديون

فوجوں کی مانند نگاہیں، فلک سے اتریں دھرتی پر
اُوپر دیکھا ہُو کا عالم، کر دیا حملہ پستی پر
میدانوں میں ملا نہ کچھ تو، گلیوں میں گھس جانا ہے
کر کے تلاش پریتم کو پھر واپس وہاں سے آنا ہے

۲۰۲

سھباز باز ٿئو ، پنکي نه ماري
اک کوٽري عرس ۾ ، لڏي مناري

باز ہوا شہباز تو اس نے چھوڑے خبط شکاروں کے
امن سے ہیں سب پنچھی، ہو گئے درست حواس بچاروں کے
اس کی آنکھیں عرش پے اور مینار پے اس کا ٹھکانہ ہے
کل تک عالم اور تھا اس کا، اب کے اور زمانہ ہے

۲۳

جنهين جان جدا ڪي، تون مُهُن نه پس
لتاڙين لتن سين، آسي لهن عرس

الگ ہوئے جو اپنے آپ سے، جا کر ان کے چہرے دیکھ
عشق نے ہیں کس ڈھب سے سجائے ان پرنور کے سہرے دیکھ
کل تک تھے جو فرش نشیں، آج عرش بریں پر بستے ہیں
دل والوں کی شان عجب! کس دلداری سے رہتے ہیں

٢٥

حقيقي مون سين، وسن شهر صقيق ۾
ڳالهه چون صقيقيان، چون صقيقي ويڻ

سچے ہیں محبوب مرے اور سچے شہر میں رہتے ہیں
سچ ہے ان کا ساون بھادوں، سچ کی چھاؤں میں پلتے ہیں
سچے قول ہیں ان کے سارے، سچے ان کے کام ہیں سب
سچے روپ ہیں ان کے سارے، سچے ان کے نام ہیں سب

۲۶

سفيفي مون سيڻ، رهن سهه سفاف ۾
ڳالهه چون سفافيان، چون سفافي ويڻ

اُجلے ہیں محبوب مرے اور اُجلے دیس میں رہتے ہیں
اُجلا جیون اُجلا تن من، اُجلے بھیس میں رہتے ہیں
اُجلا سوچیں اُجلا بولیں، اُجلی ہر اک بات اُن کی
اُجلا ڈھونڈھیں اُجلا پائیں، اُجلی ذات صفات اُن کی

٢٧

جنھين مک مرانءِ، امي اُلٽي اکڙ سٽين
جنھين جي ڳالھاءِ، معد و ٿي ساجو ٿيو

آنکھ سے جس کو دیکھ نہ پاؤں، دِل سے اس کو یاد کروں
اپنی تنہا گھڑیوں میں، یوں اپنے آپ کو شاد کروں
وہ جو بات کرے تو مَیّا! مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے جان میں جان آئی، ہر سانس میں ساجن بستا ہے

(۲۸)

ڪنجي ڏيئي جھليو، جنھين روح رساءُ
تنھين سندي تلھٽڙي، سونھاري سياءُ

سکھیوری! مرے تن من کو، یوں باندھ دیا ہے ساجن نے
جیسے گھر کو سناٹے میں، گھیر لیا ہو آنگن نے
مجھ کو باندی جس نے بنایا اس کا ہی دم بھرتی ہوں
سیدھی راہ بتائی اس نے، اسے دعائیں دیتی ہوں

٢٩

جي لوڙي تي نہ لهان، الوڙي ڏي ڏير
توڙي ڏسڻ سهڻي، انبان تل نہ ٻير

جن کو چاہوں ملیں نہ، جن کو مانگوں نا مل جائیں وہ
دِل والوں کا ملنا مشکل، بچھڑ کے ہاتھ نہ آئیں وہ
ملنے کو تو مل جائے کچھ، لیکن اس سے کام نہیں
بیر ہو چاہے کتنا اچھا، پھر بھی بیر ہے آم نہیں

۳۰

سوني ساپ نہ لوڙيان ، جي لوڙيان تہ لک
موف تنهان منڊي بک، جنهين مستڪ مڻي ملبہ

رنگ برنگے سانپ ہزاروں، پھرتے ہیں بے دام یہاں
جی چاہے تو ہم بھی کچھ کو، کو سکتے ہیں رام یہاں
لیکن ایسا سانپ جو لاشک اپنے تئیں من رکھتا ہو
اس کو ڈھونڈھ کے لانا ہے، وہ جہاں کہیں بھی رہتا ہو

(۳۱)

هن قصر در لک، ڪوڙين سهمين ڪڙڪيان
جان ٿي ڪرين پرک، تان ٿي سڄڻ سامهان

ایک محل میں لاکھوں در اور لاکھوں اس میں دریچے ہیں
ان میں سے کئی اندر باہر، اور کئی اُوپر نیچے ہیں
آنکھ اُٹھا کر دیکھو گے تم، جہاں سے بھی اور جیسے بھی
دیکھو گے اس یار کا چہرہ، ایسے بھی اور ویسے بھی

(٣٠٢)

پھرين پاڻ پرک، پوءِ پرکڻ ساڄڻ
در پيو سوئي رک، جتان ڏکا نه لهين

پہلے اپنے آپ کو پرکھ، اور بعد میں اپنے یار کو پرکھ
اپنا پرکھنا سب سے مشکل، پہلے اس دشوار کو پرکھ
ایسے در کی تلاش میں رہ جو، تیری پناہ کا ضامن ہو
دُھل جائیں سب داغ ترے اور اُجلا تیرا دامن ہو

۳۴

پرين پاڻ وڃاءِ، پاڻ وڃائي سو لهي
من اندر مُهه پاءِ، توئي اندر سپرين

عشق میں اپنا آپ گنوا دے، سب سے افضل کام یہی
اس کے بعد ہے یار کا ملنا، جس کا خوش انجام یہی
جھانک کے دیکھے گا جو اپنے من مندر میں غور سے تو
وہاں پہ ساجن کو پائے گا، متوالے! اس طور سے تو

۳۴

تون ويڄ ون ٿئي ويڄ جوڳي سو جڳ ۾
تون اسان جو پير، سو ڏي ڏيئين سرير ۾

تُو ہی اپنا ہادی و رہبر، تجھ سے ہی وہ راہ ملے
جس پہ چلتے چلتے اک دن، اپنے من کا شاہ ملے
تیرے ہی احسان سے اس عرفان سے ہم آگاہ ہوئے
جس کی بدولت کم سے کم تر لمحوں میں دی جاہ ہوئے

(۳۵)

ستاهتوس ننڊ ۾، جوڳيءَ جاڳاليوس
مڙ وڃايائين مون منان، تت ويڪايوس

نیند میں گم سم پڑا ہوا تھا، آن جگایا جوگی نے
راز الستی مجھے بتا کر، مست بنایا جوگی نے
اتر گیا جو میل تھا من پے، نکھر گیا یوں رنگ مرا
ہو گیا کندن ظاہر و باطن، روپ ہوا خوش رنگ مرا

٢٦

اپيري ۽ پيرِ، ڪنهين لڌو پيريئين
ته چون سندو پيرُ، ڪوڙين منجهين ڪونهي

اتنی آساں بات نہیں جو آ ئے مقصد پا جائے
جس کا نشاں ناپید بھلاوہ، کیسے ہاتھ آجائے
لاکھوں اور کروڑوں کھوج لگانے والے پھرتے ہیں
مشکل سے کچھ لوگ ہی اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں

۳۷

جي مهراڻ ميا ڪري ته ساگر وسهي نه سٽ
يون پريان سنديءَ ڳالهڙي، رهي نه اندر ڳهٽ

مچلے جو مہران تو ندیاں، پانی میں گم ہو جائیں
عاشق راز کی باتیں پا کر، آپ ہی گم سم ہو جائیں
کھو کر اپنے ہوش کو آخر، راز کو افشا کرتے ہیں
بیچارے مجبور ہیں ازخود، جبھی تو ایسا کرتے ہیں

(۳۸)

اُلان جيھيُ اُل، تسان نہ اسان جتيڙي
پرايان جامع اُل، تسان بيائي الھن

من کے اندر آگ جلے جو، کہیں نہ ہو گی ایسی آگ
نہیں جوالا مکھی میں بھی، اتنی جتنی اپنی آگ
عشق کی آگ جو تجھ تک پہنچے، تیرا من بھی جلنے لگے
تجھ تک کیا موقوف ہے اس سے سارا جگ ہی جلنے لگے

٣٩

لڳي وڃان پيرءِ دانهان ڪندي ڏونگرين
سونهي سڄڻ ميڙ، جنهين هٿئون ڏکئي

اُونچے پربت پر سے گزرتی، آہیں بھرتی جاؤں میں
مرتی جاؤں پھر بھی گرتی پڑتی بڑھتی جاؤں میں
یہی صدا ہے یہی دُعا ہے، یہی ہے آس پیاس اپنی
مل جائے جو وہ ماہی تو، ہو جائے پُوری آس اپنی

۴۰

تون تون تد کري ، لگنداءِ کر قند جیئن
سائین سنیار یھ ، جن یھ روح سر جیا

سر پے مصیبت آئی جب، تب ورد وظیفے یاد آئے
ملا پیر فقیر سبھی کے ساتھ، صحیفے یاد آئے
سارے چکر چھوڑ کے سیدھا ہو کر جگ میں جینا ہے
جس نے جان عنایت کی ہے، نام اسی کا لینا ہے

(۴۱)

سور جنهون کي هوءِ، ليهان تنهين اير ن
ڪاتي ڪوءِ ڏنوءِ، دانهان ڪندي سور ين

درد ہے جن کے دِل میں وہ، دن رین تڑپتے رہتے ہیں
جن کے دِل میں درد نہیں، سکھ چین سے بیٹھے ہیں
کبھی نہ دیکھا بے دردوں کو، آہیں بھرتے دنیا میں
درد ہے جن کے دل میں وہی تو، جیتے ہیں مرتے دنیا میں

(۴۲)

کاگد کالي اکر اين، مون سان مون سيڻين
گهوري ڪٽي وڃائيان، وي مَندي نيسڻين

کاغذ پہ جوں کالے حرف ہیں، میرا من یوں یار کے ساتھ
دنیا چاہے کچھ بھی کرے، پر میں ہوں اس دلدار کے ساتھ
جو یہ نین نہ دیکھیں اس کو، نکال کے پھینکوں نینوں کو
دل میں بساؤں یار کی صورت اور محبت دونوں کو

۴۲

ڪاڳد ڪالي اکرين، مٿن واچيندا آءٌ وڏو
سچڻ اچي اکرين، مٿن لوڙيندو لــڌو

کاغذ پہ جو کالے حرف ہیں وہ تو سب پہچانیں ہم
ان کے کیا کیا معنی ہیں، ہاں ساتھ ہی یہ بھی جانیں ہم
لیکن یار جو حرف سفید ہے، جیسے اُجلا بادل ہو
اس کو ڈھونڈھ کے پایا میں نے شاد نہ کیوں اب یہ دِل ہو

۴۴

ليهان لک کيام، پسڻ کي پاڙان پرين
سوجهي سيڻ لڌام، من منجهين ئي سپرين

ہم نے ہزاروں جتن کئے، پر بات کو بس میں لا نہ سکے
آس تھی جس کے ملنے کی، اس پریتم کو ہم پا نہ سکے
آخر جھانک کے دیکھا دل میں وہیں پے تھا موجود وہی
جس کے نام اور کام کئی، ہے مقصد اور مقصود وہی

۴۵

رُوئِي ڪرِ مَ پڌرو، هٿ منجهيئي جال
جان جان پريان نه مڙءِ، تن ڪاٽي جئُن پال

روکر ظاہر بات نہ کرنا، من میں گھلتے رہنا تو
راز بھرم کا باعث ہے اسے راز ہی رہنے دینا تو
جب تک جانی ملے نہ تب تک، ہجر کے غم میں گھلتا رہ
سُلگ رہی ہو جیسے گیلی لکڑی ایسے سُلگتا رہ

۴۶

هسڻ ڪت سهجڙيءِ، روئين ڪي ناهين
پريان پسڻ جوڳيان، اکين تو ناهين

ہنستے ہو یوں جیسے تیرے کارن کچھ بھی ہوا نہیں
تیرے ساتھ ہوا جو تیری عقل نے اس کو چھوا نہیں
ساجن کو جو دیکھ سکیں وہ آنکھیں تیرے پاس کہاں
تجھے تو رونا چاہیئے لیکن تجھے بھلا احساس کہاں

۴۷

پريان سنديءَ ڳالهڙي، مر منجهين ئي هوءِ
پڌائين پين ڪي، ڪيهو ڪاج ستريوءِ

دِل والوں کی باتیں دِل میں، دِل کے باہر درست نہیں
دِل کی بات جو باہر لائے، وہ کوئی اچھا دوست نہیں
دِل کی باتیں دُنیا کو، بتلاؤ گے پچھتاؤ گے
آپ ہی اپنی نگاہوں میں گر جاؤ گے مر جاؤ گے

(۴۸)

وچارن وي پٺ ۾ توجهه پاهه نڪري
اسان هنجڻون هٿ ۾ ڪامٽن لوسٽن منجهه ٿيو

بھٹے میں جب اینٹ جلے اور جل کر پختہ ہو جائے
محلوں کی بنیاد بنے، دیوار کا پُشتہ ہو جائے
تو بھی جل کر پختہ ہو جا! دُکھوں کے انگاروں میں
جیسے جلتے بُجھتے ہیں ہم خود جاں سوز بچاروں میں

۴۹

انها اندر ماهه، ٻاهر ڏک نه پڌرا
ويد ڪريندو انهن پسان سي واڍو وڙا

ماس میں گہرے کھاؤ ہیں لیکن، باہر دکھتے نہیں کبھی
دِل والوں کے درد انوکھے، ظاہر ہوتے نہیں کبھی
ایسے گھایل جن کو دیکھ کے وید بھی آئیں اچرج میں
اتنے گھاؤ اور اتنی اذیّت، پھر بھی ہیں یہ دھرج میں

٥٠

ڪڏهن ٻيري ٻور، ڪڏهن ڦل نه هڪڙو
ڪڏهن پرِيان جا ٻور، ڪڏهن سڪان سڌ کي

کبھی تو بیری ہری بھری اور بور سے بھی بھرپور رہے
کبھی تو پھل سے بھی محروم اور سائے سے بھی دُور رہے
اپنا بھی ہے حال یہی، خوشحال کبھی بدحال کبھی
کبھی تو یار کی یاد میں شاد اور ہجر کے غم میں نڈھال کبھی

۵۱

سوڙهيان سنهڙو، جتن ڪيوءِ نہ تينءَ
توکي اکڙين ۾، پرين پيندو ڪينءَ

تم نے تو سوچا ہی نہیں تھا، اس دلدار کے بارے میں
اور نہ کبھی اظہار کیا تھا، کچھ دیدار کے بارے میں
تیری آنکھیں رہتی آئیں، محروم اس کے جلووں سے
اب تو نہیں ہے تیرے نصیب میں، کچھ بھی اس کے عشووں سے

۵۲

روزِ محشر ڏينهڙي، ستر سج تپن
سيوٽي جر پانٺيان، جي مون پرين مٿان

حشر کے دن جب تپتا سورج، سَر کے اُوپر آئے گا
اور غضب کی گرمی سے، یہ جسم جُھلستا جائے گا
ایسے میں وہ رشکِ چمن جو مجھے وہاں مل جائے گا
رُوح کو ٹھنڈک پہنچے گی اور دِل کو آنھت آئے گا

۵۴

جيءَ تہ لائي رچ مچ، تو چپڻ لکڻ ناهہ
زهر هلاهل هٿ ڪر، ڪاڙهہ پيان ڪاهہ

عشق میں اپنا آپ چھپانا یہ تو اچھی ریت نہیں
عشق میں ہار بھی جیت ہے پیارے ہار نہیں تو جیت نہیں
جگ والوں کا جینا کیسا، عشق میں مر کر جینا ہے
آبِ حیات کی بات نہ کر، یاں زہر ہلاہل پینا ہے

(۵۴)

ٽڪو ٽيڏو وهيءِ، جيڏو مهه مهراڻ
ڏيهه سيوٽي هڪڙو ءِ ڏير لڏو سين پاڻ

لاکھوں میلے دنیا کے پر مجھے نہ آئے راس کبھی
لوگ تو چاروں جانب میرے، میں نا ان کے پاس کبھی
جہاں پے اپنا ماہ منور، آنکھوں کی شب رات وہاں
اس کا جلوہ اس کا جادو، جذبوں کی بارات وہاں

۵۵

باڙي ۾ ٻڙ هڪڙو، سو مون گھڻو سھاءِ
تاڙ ولاسي سڄڻان، چڙي پيي وٺاءِ

جتنی وسعت دریا میں ہے، اتنا ہی وہ بہتا ہے
کبھی ہے تیز آہستہ کبھی، یہ فرق بھی اکثر رہتا ہے
اس کے اتار چڑھاؤ سے ہم نے، ڈھنگ نرالے سیکھے ہیں
دھیرج کا ہے رنگ انوکھا باقی تو سب پھیکے ہیں

٥٦

ٻاڙيءَ ۾ ٻڙ هيڪڙو، سو مون گهڻو سهاءِ
نا ولا سي سڄڻان، ڇڙيءَ پيي وڻراءِ

سارے کھیت میں ایک ہی پیڑ ہے جس کا سایہ نعمت ہے
اپنا سُکھ اور چین اسی سے، اپنے لیے یہ رحمت ہے
جنگل تو یہ ہو نہیں سکتا، تاہم اس سے کم نہیں یہ!
دِل سے نکلتی ہے یہ دعا، بڑھتا ہی رہے بس اب یہیں یہ!

٥٧

ماءُ مصلئا ويس، هاڻي ويٺي وساريون
عيد ڪريندو ڪير، ماکي سڄڻ گڏيو

راس نہ آئی ہمیں عبادت، جب تک یار سے دُور رہے
سب کچھ ٹھیک مگر ہم اپنی، مشکل میں محصور رہے
اب جو ملا وہ عید کا چاند، تو عید ہوئی دِل والوں کی
اب تو حاجت نہیں رہی کچھ، تسبیح، تہجد، فالوں کی

۵۸

جئين ڦقرا ۾ ماهه، ايئن روزه عيد نماز
اجا آهي ڪاءِ بيءِ، الله دي هاج

روزے خوب نمازیں اچھی، لیکن ہے وہ بات الگ
جس سے خدا مل جائے پل میں، صدیوں کی ہے گھات الگ
جیسے کلیجہ ماس نہیں، ہیں روزے اور نمازیں یوں
جان کر صدقہ، رہنے دے سب نذریں اور نیازیں یوں

(۵۹)

پتو ڦٽو پيٽ ۾، وڏي مـلان مـاھ
ڏوٿين ڏتي ڏوڙ ۾، الله اوري آءُ

پھوٹ گیا پتہ پیٹ کے اندر، چھل گیا جسم جراحت میں
لگ گئے ہاتھ اناڑی کے، اور پڑ گیا فـرق شباہت میں
بھاڑ میں جـائے ایسا علاج، اور ایسا معالج رب میرے
تجھ سے کام اور تو ہی بنا ئے، اپنا کارج رب میرے

٦٠

قاضي ڪٿ مَ ايترو، متِ ڪيروئي پير
پلا ٽيندو پوتلي، متي ڪيند ڪير

واعظ صاحب! اپنی عقل کو پاؤں کے نیچے ہٹنے نہ تو
اکڑ کے اپنی ذات پہ اپنے آپ کو پیچھے ہٹنے نہ تو
اک دن چلتے چلتے اچانک، بھگدڑ جو مچ جائے گی
تیرے وعظ کی یہ گٹھڑی، تب یہیں کہیں رہ جائے گی

٦١

مکڻ مکيان کي ، مـلان کـٽي کـين
پيچ کـڌهن بہ تن کـي ، هوجي ء ب گهرين

اکثر لوگ تو مکھن سے پر چکنی چوری کھــاتے ہیں
اپنے پیٹ کی آگ بجھا کر، اوروں کو ترساتے ہیں
پوچھے کوئی ان سے جا کر، یہ بھی کوئی بات ہوئی
ان کا کیا ہو ، بھوک میں جن کی بسر بھیانک رات ہوئی

(٦٢)

ڏ نئين پاڙ وڪاڙ ڪون، جيڪو تنهنجي وات
وڏي خالق نه گهرئين، ڪرين پاٽري تات

اس لیے تجھ کو زبان ملی، کہ تو سب سے حسن کلام کرے
جس کو سُنے جو اس کے اثر سے جگ میں اچھا کام کرے
لیکن تیرا فعل بُرا اور تیرا ہر اک قول بُرا
کر دیا تو نے اپنے کئے سے، سارا ہی ماحول بُرا

(٦٣)

تنهن پڇي اسان، تون اسين نهين پڇيو
پڙهڻ هار، قرآن، نهين، تو رحمان سان

تم نے پوچھا ہم نے بتایا، پھر بھی سمجھ نہ پائے تم
علم نہ تھا تو اپنے پرائے، کسی کے کام نہ آئے تم
کچھ بھی تیرے پاس نہیں تو پڑھے گا کیا قرآن بھلا
اور پڑھے گا بھی تو کیسے، پرچھے گا رحمان بھلا

۶۴

علت وهيئيس نام عادت کڏهن نه جاءِ
اُٺ ڪنڪئہ ءِ چڏئوم چٽ جواسا ڪاءِ

اُونٹ کی فطرت ماشاءاللہ، اُونٹ کی علت کیا کہنا
بے چارہ ہے عادت سے مجبور نہایت کیا کہنا
لمبے ہونٹ اڈھنگے جبڑے، جو آئے نِچ جائے نا
جوانسہ اس کا من بھاتا ہے، گندم کو چکھ پائے نا

٦٥

جن محبت من ۾، تي مٿلي ٿي سوپين
تن ۾ ٻلهءِ مشعلان، سه سدا سپرين

جن کے من میں محبت ہے وہ مر گئے تب بھی زندہ ہیں
نہیں ہے جن میں یہ جوہر وہ جیتے جی بھی مردہ ہیں
پیار کی شمع جلا دی جس نے اپنے دھندلے اندر میں
ساجن ہوگا وہیں پہ ساکن، جیسے دیوا مندر میں

٦٦

سچي سائين ساڻ، توکر مَ ڪوڙيڪوڙيان
جي تو منجھ هياتو، سيو ڪلي پہ ڪٹو

تیرا سائیں سچّا پھر بھی، جھوٹ سے تیرا ناتہ ہے
سچ کے بدلے جھُوٹ کا سودا، کیسا تیرا کھاتہ ہے
توڑ دے جھُوٹ سے اپنا رشتہ، باز آ اس مکاری سے
واقف ہے وہ سائیں تیرا، تیری ہر عیّاری سے

۶۷

سيڻان سندو سڳيو ۽ پپيھو آيو
لکي لوڪ نہ سگھئو ۽ اسان ڳالھايو

ساجن پار سے آج پپیہا آیا میرے آنگن میں
میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا وہ میٹھے بولن میں
میں نے سمجھا اور نہ سمجھا، کسی نے اس کی باتوں کو
میں ہی جانوں اور کوئی کیا، جانے ایسے ناتوں کو

٦٨

جتي سچ سنسار سان، سه جا سائين ساڻ هوءِ
تو پڏري يي ٻيڙا تري، جي تان نير نه ڪوءِ

دُنیا میں ہے جہاں بھی سچّ ہے وہیں پہ سایہ سائیں کا
سچّ ہے جس کے ساتھ ہے اس کے ساتھ یہ سایہ سائیں کا
سچّ پہ بھروسہ جس نے کیا، وہ سائیں اُس کا یار ہوا
پانی تو کیا خشکی سے بھی اُس کا بیڑا پار ہوا

٦٩

سچ پيارا سائينيان ۽ سائين ۾ سچ سهاءِ
سچي منگل نہ دهہ ءِ ۽ سچي سرپ نہ کاءِ
سچ سمندان سر چڙهہ ءِ ۽ کوڙ ڪ ڪائين باهہ
جڏهون ڪڏهون ڪوڙ کي ۽ ڏيندو سچ سزاءِ

سچ ہے پیارا سائیں کو، اور سچ ہی اس کو بھاتا ہے
سچے کو نہیں آگ کا ڈر، اور سانپ نہ اس کو ڈستا ہے
سچ ہے موج سمندر کی، اور جھوٹ ہے شعلہ تنکوں کا
سچ کی سزائیں جھوٹ پہ ثابت، نہیں تقابل دونوں کا

(٧٥)

نہ کاءِ پاڻيءَ منجھہ پاپيھا ٻڌي مــٺا
جي توچوي سمنجھہ تان تون کيرو تـيـوين

ایسا بھی ہوتا ہے جو پنچھی پانی ہی میں رہتے ہیں
کبھی کبھار وہ پیاس کے مارے پانی ہی میں مرتے ہیں
تیری بھی جو سمجھ میں آئے، یہی انوکھا بھید میاں!
تو بھی ہو آزاد رہے نا، یونہی جہل میں قید میاں!

۷۱

تان تان سُورا، سڀ ڪوءِ، جان جان مھڙ مِڙن
ڙڪ وھندي سامھين، سوڙي سي جياڻ

جنگ کے میداں سے جو باہر رہے وہ بہادر ہوتا ہے
کسی کو باور آئے نہ آئے، اسے تو باور ہوتا ہے
پر جب چلتی ہیں تلواریں، خون کے دریا بہتے ہیں
ایسے میں جانباز ہی جنگ کے میداں کا رُخ کرتے ہیں

۷۲

ٻي مون ڏيئين لک ڌڙ، ڌڙ ڌڙ لک سِران
سِر سِر لک مهان تيئين، مهه مهه لک ڄڀيان
سڀيي ڄڀيان ٽڪيان، هڪ ٻيان لوانِ
صفت تنهنجي راڄيا، تون هون ڪيئن ڪران

لاکھوں دھڑ ہوں میرے اگر، ہر دھڑ پہ لاکھوں ہی سَر ہوں
ہر سَر کے ہوں لاکھوں مُنہ، جن میں زبانیں زائد تر ہوں
تب بھی تری تعریف نہیں ہو ممکن اتنی زبانوں سے
بالاتر ہے ذات تری او مالک مرے بیانوں سے

۷۳

جهڙي پاڻي هڙڙي ، تهڙي پاڻ پرين
ٻهڻ مڇا ڇنڊيو ، تون نه ڇنڊ ڏسڻي

دینے والے! مانگنے والوں کو تو سب کچھ دیتے ہو
جس کا جتنا دامن ہے، اتنا ہی اسے بھر دیتے ہو
میں نے بھی اب اپنا دامن، تیرے آگے پھیلایا ہے
اپنے جس کو چھوڑ چکے وہ، تیرے دوار پہ آیا ہے

۷۴

ڏيهه لٿا منجها پٽي ، اڳون آئي رات
ڪڙا پڪاري پاتڻي ، ٻيڙا ڪير وات

بیت گیا دن رات آئی، ہے چاروں سمت اندھیرا بھئی!
کشتی ہے گرداب میں جس کو، طوفانوں نے گھیرا بھئی!
دور کہیں سے کھڑا پکارے، کھیون ہارا ہیارے!!
بھنور میں کشتی آن پھنسی ہے، کوئی بچائے بھیّا رے!!

۷۵

هن آءُ وِنداوچ تون سيٽا ويڙمَ ڪ ت
پيهي منجهه ڪٽوڪري، توکوٽي موَنهت

اپنے آپ پے اترانا اور اپنا ہی دم بھرنا کیا
چھوڑ دی ایسی باتیں، رُتبہ اوروں کا کم کرنا کیا
پیس لے اپنے آپ کو جیسے چکی پیسے آٹے کو
کیسے پر ہو ہاتھ ترا، کر زیر اسی سے آپے کو

۷۶

سڀئي تني جباب ڇٽي، سو سڄڻ ڪڏ ڪٽي
جتي بال سرير ۾، تتي چڻ ٻٽي

سونا آنگن بتا رہا ہے، کہاں گئے گھر والے وہ
جن کے ٹھاٹھ تھے شاہانہ، یا شاہ تھے خود متوالے وہ
ہو گئے داخل دھرتی میں سب، رہے نہ حال بحال ان کے
گل گیا ماس اور سڑ گئیں ہڈیاں، جھڑ گئے سارے بال ان کے

۷۷

پيڙان سيي ڏهيليان، ايهي پيڙنه ڪاءِ
جيئن وڄن واڄوٽئي، ڄاڻهءِ هڪ خدا

دُکھ تو سب کے دُہرے لیکن توبہ زاری اپنے دُکھ!
جیسے بوُجھ پہاڑوں کے، ہیں ایسے بھاری اپنے دُکھ!
زور سے جیسے بجیں نقارے، سُنتے ہی سَر پھٹنے لگے
ایسا ہی ہو حال اپنا، جب دُکھ کی ٹیس اُبھرنے لگے

۷۸

ٻئن کون ڪيا روئڻي، ڏک اپڻي کون روءِ
ٻنڌ سنيل تي ساختي، ات نه هسي کوءِ

اوروں کے دُکھ پر کیا رونا، اپنے دُکھ پر رُو پیارے!
اپنا آپ سنبھال وگرنہ، لُٹ جاؤ گے او پیارے!
باندھ لے اپنا رختِ سفر، سب لوگ ہیں تیاری میں یہاں
تجھے بھی آخر جانا ہے، یوں بیٹھ نہ بے کاری میں یہاں

۷۹

ستو ڪي هم ساءِ، تو مٿي ڪپر ڪڙڪي
رهڻ تنا ٿين ڪاءِ، جتي تنهنجو تڪيو

شور وہاں گردابوں کا، اور تجھے یہاں کچھ خبر نہیں
سوئے ہوئے جان بھلا کیوں، تجھ پے کوئی اثر نہیں
واجب ہے یہ قرار وہاں پر، جہاں پے اپنا ٹھکانہ ہے
یہاں تو تن بھی نہیں ہے اپنا، پھر کا ہے کا بہانہ ہے

٨٠

ستو سڄي راتِ، مهڏ ڪي مُئن جيئن
نه تو سنبل تاتِ، نه جهوري تو آهه ڪا

سوئے ہو مُنہ ڈھانپ کے ساری رات کہ جیسے میّت ہو
پڑے رہے بے حال کہ گویا، اُٹھنے کی نہ کوئی نیّت ہو
جینے کی تجھے فکر نہیں کیوں، او دیوانے جاگ ذرا
کیا ہو گا انجام ترا، اُٹھ! او انجانے جاگ ذرا

٨١

جان جان ڪنڌي ڪاءِ، تان تون ترهي تاتڙ،
ڪپر سندي واهه، مت اوچتي اُلهئين

جب تک ہے تو کنارے پر اور تیرے پاس ہے کشتی تِری
تب تک چاہیئے حوصلہ سالم، اس کے علاوہ چُستی تِری
ممکن ہے کہ اچانک تجھ پہ آئے مصیبت ساحل سے
اور آ کر ٹکرائے اِک دم وہ تجھ جیسے غافل سے

۸۲

جي تل تنو تلهڙي، سايه منجھ ٿيانھ
ڪر ٻانهاٻاٽيچيان، مَ ڪر سڌ هيانھ

طوفانوں کی زد میں آکر، کشتی ٹوٹ چکی ہے تو!
تو ہے حوالے موجوں کے، تیری قسمت پھوٹ چکی ہے تو!
رکھ تو بھروسہ اپنے آپ پے، ہمت ہار نہ تو!
زور لگالے بازوؤں کا، اور کسی کو پکار نہ تو!

(۸۳)

سنجهي سبي تلهترا، غـافـل چونه وڌو ۽
جڏهون لهرين گم ٿئي، تڏهون سنڀاريو

تم نے پہلے کیوں نہ سنبھالا، غافل اپنی کشتی کو
اب جب بھنور میں آن پھنسے ہو، دیکھ رہے ہو پستی کو
تب کرتے ہو یاد کہ اپنی کشتی بہت پُرانی تھی
ایسی کشتی پر اِترانا، تیری بڑی نادانی تھی

١۴

جان تون تار، وپاڻ ، تان پيي پيچ تلڳان ڪِل
تو تون گهڻا سڄاڻ ، رڇيي ڪپر آهلي

مان لیا تم ماہر ہو، ہے دریاؤں پر دھاک تِری
طوفانوں کا خوف نہیں کچھ، ہستی ہے بے باک تِری
پھر بھی اچھا ہے کہ تمہارا، ربط ہو رہبر کامل سے
ورنہ بہت سے ماہر بھی جا ٹکراتے ہیں ساحل سے

۸۵

اپاٽي چيٽون جي، سو نه ڪيائين ڪن
تان ٽي پيٽي پر يان سان گهگهه گهاتوڙن

دریا میں جو پاؤں دھرا تو، مگرمچھوں نے شور کیا
پانی بہت ہی گہرا ہے او غافل! تو نے غور کیا
پر نہ سُنا کچھ اس نے جو تھی محوِ وصال کی خوشیوں میں
موجوں نے جو گھیر لیا تو پہنچی موت کی گلیوں میں

٨٦

جنگيئون جوکيون جت، پوهت پاتا ڙاڻين
مهر تنهنجي تيت ، مکريان پيي پار يون

پربت جیسے بیڑوں کے بھی جہاں پے تختے اُلٹ گئے
ملاحوں کی مات ہوئی مت آئے بھاگ بھی پلٹ گئے
ایسے میں جو تیری حمایت پہنچی طوفان بھاگ اُٹھے
اپنی ہمت کر گئی کام اور سوئے بھاگ بھی جاگ اُٹھے

۸۷

پکڙيان ڊ جنھ ، پئو ٻيلان ٿي نہ لھي
جتي ساٿ منڊ ، اچي سہ لکن لنگھيو

پنچھی اُڑتے ڈریں جہاں اور جائے نہ آدم زاد وہاں
خوف کے مارے جان ہی جائے، ویرانے آباد وہاں
تیرا ساتھ میسّر ہو تو، خطروں میں گھر جائیں گے
تیرے فدائی تیری خاطر، سب کچھ ہی کر جائیں گے

۸۸

وڄ ٻادل ۾ واءُ، ڊيڄ نہ لهرين لڳ شو
سدہ سونهان جان ٿُم ٻيڙي ٻڏڻ ناهہ پيو

بادل ہوں یا بجلی ہو، یا تند ہوائیں گرداگرد
موجیں بھی ہوں بپھری ہوئی، جو اُچھلتی آئیں گرداگرد
تیرا رہبر کامل ہے تو خطرے کی کوئی بات نہیں
کشتی بچ کے نکل جائے گی، پیارے تیری مات نہیں

٨٩

ستو ھتو جاڳ بارا تڙي سيڻي وھائيان
مٿڻ تنوُ ياڳ ، پرين وسارڻ مَ ڪر

سوئے ہو تو جاگو بھئی! اب رات کا سمیہ انت ہوا
جو سویا وہ کھویا حاصل اسے نہ کوئی پنت ہوا
سورج بن کر چمک رہا ہے، تیرے آنگن بھاگ ترا
ساجن کو کر یاد کہ بھاگے، کوسوں دور ابھاگ ترا

٩٠

پرين وساري رت ۾ روئن ۾ ڪنڍيري ڪلرٽ
ڪنچن راس وڃاءِ ڪي ۾ پڪٽ ڏوڙ پون

بھلا چکے جو ساجن کو وہ کاہے نیر بہاتے ہیں
روئیں اپنی عقل کو جس کی شہ پر گھاٹا پاتے ہیں
سونا ان کے پاس تھا لیکن، قدر نہ اس کی جان سکے
اپنی مت تو ماری گئی، کسی اور کی بات نہ مان سکے

٩١

ڌر جيون ڌونس سهن، ڳر وانٺي پربت جيون
سيٺي سيڻ ڪڇن، آٺي واءُ نه، ڌولن

دھرتی کی مانند سہیں جو دُھونس، ہلیں نہ ہلانے سے
پربت جیسے بھاری ہوں اور کھسک سکیں نہ ٹھکانے سے
ایسے ہی دل والوں اور دیوانوں سے رکھ پریت اپنی
ان کی طرح ہی مہر و وفا کو بنالے جگ میں ریت اپنی

٩٢

سَجڻ در جڻ دءِ کھي چت نہ کیجئي پنگ
لوٺي ٿيئي پار چپي، لاک نہ چڏي ر نگ

اپنا پرایا جو بھی کہے کچھ، من کیوں میلا کرتے ہو
بُرا کہے جو بُرا ہے خود وہ، تم کیوں آخر ڈرتے ہو
اچھائی کو آنچ نہیں ہے، نام نہ اس کا مٹتا ہے
چادر چیتھڑ بن جاتی ہے، رنگ تو پھر بھی رہتا ہے

٩٤

منجهين ماڻُو ناهه ڪي، پسڻ ڪي گهاٽي
دني ڪسونبي رنگ جيون، وينه وٺي واٽي

اندر تو موجود نہیں کچھ، باہر گہرا رنگ اس کا
پل بھر میں یہ رنگ اُڑے تو، روپ بنے بے رنگ اس کا
کیسا رنگ اور کیسی چنریا، اک دن ایسا آئے گا
سب کچھ پھیکا پڑ جائے گا، سارا رنگ اڑ جائے گا

٩٤

مٺن پاڻيءَ سون ، هي جر يوس جر ڪٺو
ويٺن وراڻيءَ وٽن ، کوهه لڳي ڪارو ٿيو

دُور سے اُٹھ کر اِک لشکارا، آنکھ سے دِل میں اُتر گیا
میں نے سمجھا پگھل کے سونا، دھرتی پر ہے بکھر گیا
مین نے اس میں ہاتھ جو ڈالا، ہوگیا گدلا ہاتھ مِرا
میلا پانی تھا وہ جس سے ہوگیا میلا ہاتھ مِرا

۹۵

ڀُلي وي ڀُلي، ڀلي تـڳائون آئي
بابا آدم آتي حوا ڀلي، ڀلي سڀ دنيائي

اپنے آپ میں گم ہے دنیا، اوّل سے اس کی بھول یہی
جیسے بھولے آدم و حوا، سب کی بھول فضول یہی
تم بھی بھولے ہم بھی بھولے، سارے بھولے دنیا میں
پھر بھی اپنے آپ کو ہر اِک، دانا بولے دنیا میں

٩٦

پيو اساري ماڻڪ، رجات جت پگهي پوري
ڪوهه نه ڏي نديه ۽ تت، تون به اونگهيو هٿ ڪر

بھاگ نہ پگلی! اِدھر اُدھر کو، اُٹھا لے موتی ہاتھوں میں
موتی جیسا من ہے تیرا، موتی تیرے بھاگوں میں
جھوٹے جگ میں سچے موتی، سچائی کی علامت ہیں
سنبھال کے رکھنا ان کو اپنے پاس یہ رب کی نعمت ہیں

٩٧

پوري پئي جاءِ، ماڻڪ اسار ي پيو
سري صرافن آءُ، تون ٻه اينگهيو هٿ ڪر

پگلی عورت! اِدھر اُدھر کیوں بھاگ رہی ہو حیرت میں
موتی تیرے قدموں نیچے اور تو حیراں حیرت میں
اُٹھالے موتی اور دکھا دے، جاکر صرافوں کو
جو پرکھیں اور پہچانیں، ایسی اصلی نقلی چیزوں کو

۹۸

هتّ ویا جهٹن لوٹ، کستوری جهنگٹن گهری
سچان دي صابوݨ، اچا اندر نه کري

نمک خرید کے گاہک، جھنگ میں مانگیں مشک بقالوں سے
ایسا بھی ہوتا ہے دھوکہ، جگ میں بھولے بھالوں سے
سچائی کے صابن سے جو، میلے من کو دھوئے گا
جھوٹ فریب کے داؤ میں اپنا، کبھی نہ کچھ بھی کھوئے گا

99

مباڻ محلاڻ، منڊيان، اڇليان، ڇپلين!
هٿون ڳنن ٻڪري، جهنگڻ اُٿ مڱن!

منڈیوں میں اور محلوں میں موجود ہیں سودے باز یہاں
سادہ دلوں کو لوٹیں پھر بھی بنے رہیں دمساز یہاں
سب سے ان کا رشتہ ناتہ، سب کو دوست بناتے ہیں
دھوکہ پیشہ ہے ان کا یہ اس سے کام چلاتے ہیں

(١٠٠)

هر هر فال ڪر ٻنديان ، رڌي ڳڻتي وهلي
وڃي پوري ، ڇو ساڻون ستيان لاوي لڳن آهِ

فال پہ فال نکلوا کر، دہقان نے کھیت اجاڑ دیا
دیکھ تو کیسے احمق نے، یوں سارا کام بگاڑ دیا
ساون جب آیا تھا تو یہ، لمبی تان کے سویا تھا
اب کیا کاٹے، اپنے ہاتھوں اس نے کچھ بھی نہ بویا تھا

۱۰۱

توبه ڪري نه ٻاهڙي، ٻاهڙي توبه ڪرين
ڪيهي ساري هٿ ۾ مرڏي اجاڙين

اپنے کئے پر پچھتائیں نا، بعد میں توبہ کرتے ہیں
تیرے جیسے لوگ بہت سے، جو ایسا دم بھرتے ہیں
ایسی حماقت سے تو ساری پکی پکائی لُٹ جائے
اس سے حاصل گیا ہوگا جب بنی بنائی لُٹ جائے

(۱۰۲)

جي سائين سون سچ، تو پوکڙ اسٽڙي
اپاتي ڪر نيچ، توڙي اگھڙا ٻلهءُ

سچ پہ ثابت قدم رہا جو، اسے نہ خوف و ملال رہا
جھوٹ پہ جو بھی ڈٹا رہا وہ زیرِ وبال و زوال رہا
سچا لوٹے انگاروں پر، تب بھی گزند نہ پہنچے اسے
جھوٹا لیٹے کمخوابوں پر، تو بھی چین نہ سوجھے اسے

(١٠٣)

پاڻي واڻي، رنگ ۾، پاڻُو واڻ رتاس
رنگيندڙ و پاڻ ڏٺيم سيپي رنگ سنداس

اپنا رنگ جو آیا راس تو اپنے رنگ میں راس ہوئے
اور جو رنگ تھے اس جگ کے، سب دیکھا دیکھی ناس ہوئے
سارے رنگ اس مالک کے، جو خالق سارے رنگوں کا
دل کی آنکھ سے دیکھے کوئی، رُوپ پیارے رنگوں کا

۱۰۴

انان ٿي پنا ڪري ۽ پنان منجهانئو
راج تنهنجو راجيا، بيا راڙ ڙي راڙ

پتوں سے تو اناج اُپائے، اناج سے پتے پیدا ہوں
یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، ایسے رنگ ہویدا ہوں
تو ہی سب کا خالق و مالک، تو ہی حاکم ہر اِک کا
تو ہی راجہ راجاؤں کا، تو ہی عالم ہر اِک کا

(۱۰۵)

کوسي کوپل نيچجي، تاڙي بن واهي
عقل غيب الله دام الله ٿئي آهي

اِک پل ایسا اِک پل ویسا، پل میں کیا کیا ہو جائے
پل میں سب کچھ ہاتھ آجائے، پل میں سب کچھ کھو جائے
کیا ہے طلسم اور کیا ہے تماشہ، اپنی عقل ہے دنگ یہاں
جاننے والا سب کچھ جانے، جس کے ہیں سب رنگ یہاں

(١٠٦)

توڙي وڃين ڏور ۾، ناھ نصيبئون اڳرو
ماني وٽئين تو ۾، جي لکيا ڄڀين

کچھ نہ بنے گا تجھ سے چل ہے، جہاں کہیں بھی جاؤ گے
لکھا ہے جو نصیبوں میں، تو اَنت وہی تم پاؤ گے
روزِ ازل سے تیرا جو مقسوم ہے تیرے حسابوں میں
وہی پڑے گا تیرے پلے، لکھا ہے یوں کتابوں میں

(١٠٧)

توڙي نه ڏيئين ، توءِ توج تنهنجو آسرو
تو در ڇڏيان ڪيئن ، اي وڏا راڄيا

تو ہی سب کو دیتا ہے اور تجھ سے سب کچھ ملتا ہے
تو جو نا بھی دے تو پھر بھی، تجھ پے تکیہ رہتا ہے
تیرا دَر اور اپنا سَر، اس در سے مُرادیں پائیں گے
چھوڑ کے تیرا دَر او مالک! کہاں بھلا ہم جائیں گے

١٠٨

آهه الاهه، ڪوءِ مَ لاهيو ڪنڌ هين
وياڪاج هٿانوءِ، وڏ آئيندڙ وڏو ڏٺي

اس کی آس محبت اس کی، اس کا ساتھ سہارا اس کا
اس نے اس کا کام بنایا، جس نے نام پکارا، اس کا
وہی بنائے وہی بگاڑے، مالک اور مختار وہی
سارا تانا بانا اس کا، صاحب اور سرکار وہی

(۱۰۹)

تون آڌار سڌار تون، تون اڌا ٿون آڌ
تون ئي اکڙين مون، تون ئي اندر هنڌ
ڳل لڳي ڳالھ چوان، ڪيھي حاجت سنڌ

آپ ہی میرے حامی و حافظ، آپ ہی میرے پرور ہو
آپ ہی میری آنکھوں میں، آپ ہی میرے اندر ہو
جانے ہیں سب آپ اگر میں خاموشی میں بات کروں
مجھے ضرورت کیا ہے جو میں سرگوشی میں بات کروں

١١٠

سيچاڻان اتي سينهن ڏ وٽين سين وسن جهنگ ۾
سوڪتر ڪاوڻ ڪيئن ، ماس جنهين ڪو لکيو

جنگل کے ہیں باسی دونوں، شیر و ہیں شہباز وہیں
دونوں بھی ہیں عجیب انوکھے جینے کے انداز وہیں
دونوں کا ہے کام شکار اور چاہیئے کچا ماس انہیں
ماس ہی لاس ماس کھائیں، راس نہ آئے گھاس انہیں

111

جي جي ٻولي مٹن ڪيٹي، سو سمجھ نہ ٿيان
اس چنگي ديوان مٹن، سيپي مکر گيان

بھول گئے سب وعدے اپنے اس سے کئے تھے جو ہم نے
کچھ بھی نہ ہم سے بن پایا، جو بنا، گنوایا سو ہم نے
پھر بھی عاشق کہلاتے ہیں، پھر بھی یار سے یاری ہے
یارو، ہم سے کچھ نہیں کہنا، یہ تو دنیا داری ہے

(۱۱۲)

ڀڳا سا ڇا نہ ٿيئي، مَن موتا هل ڪچ
ڪنين سڻا نہ سنئي آکين ڏٺو سَچ

ٹوٹا جو اِک بار دوبارہ، جُڑ نہ سکا کسی حیلے سے
من کا مانک نازک تر ہے، نازک تر ہر شیشے سے
سُنی سُنائی باتوں میں جو اُلجھے گا، وہ ڈوبے گا
آنکھوں دیکھی بات سے ہر اِک مشکل کا حل نکلے گا

= تمت =